مجلہ

مدیر تحریر
مسعود احمد الاعظمی

نائب مدیر
انور رشید الاعظمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ نے جزیرۂ عرب جیسی سنگلاخ زمین میں ایمان واسلام کی وہ بہار پیدا کر دی تھی کہ چند برسوں میں پورا خطۂ عرب سرسبز وشاداب ہو گیا تھا، اور پھر مختصر سی مدت بھی نہیں گزری کہ یہ بہار سرزمین عرب سے نکل کر دوسرے علاقوں اور خطوں تک پہنچی، اور جس علاقے میں پہنچی اس کے چپے چپے کو کشت زار بنا دیا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم وہ نسخۂ کیمیا لے کر آئے تھے کہ عرب جیسی قوم کو، جو بت پرستی، کفر وشرک اور گمراہی کے علاوہ اپنے وحشی پن میں بھی مشہور تھی، اتنی مقدس، پاکیزہ اور مہذب جماعت بنا دیا کہ پوری انسانی تاریخ میں اتنی مقدس و پاکیزہ اور مہذب جماعت اور اتنے اعلی کردار کے حامل افراد نہیں مل سکتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم وتربیت سے جو سوسائٹی تشکیل دی تھی، اس کا ہر فرد اپنی جگہ مہر وماہ اور آفتاب وماہتاب تھا، جو اپنی ضوفشانیوں اور ضیا پاشیوں سے ایک جہاں کو روشن اور منور کرتا تھا، اور دین ومذہب کی تعلیم کے ساتھ علم ومعرفت کی روشنی بکھیرتا تھا۔

اسلام کی یا سرتاج انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی تعلیم صرف نماز روزہ یا دوسری عبادات تک محدود نہیں تھی۔ آپ کا لایا ہوا دین اور پیش کی ہوئی تعلیم زندگی کے ایک ایک شعبے پر محیط ہے، انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے، جس کے بارے میں اسلام میں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات وسیرت میں واضح تعلیم موجود نہ ہو۔ اسلام کی اشاعت میں عبادات وریاضات سے زیادہ مسلمانوں کے اخلاق وکردار نے موثر کردار ادا کیا تھا۔ نماز وروزہ اور اس جیسی دیگر عبادتیں تو آدمی کے تعلق مع اللہ کی علامات ہیں، اور بلاشبہہ انسان کی روحانی معراج اور آخرت میں اس کے لیے باعث نجات ہیں۔ لیکن دوسری قومیں جو اسلام کے محاسن سے آشنا نہیں ہیں، جن کی اسلام کے

بارے میں معلومات صفر سے بھی نیچے ہے، جو اسلام کی تعلیم اوراس کی خوبیوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں، کیا وہ محض ہماری نماز اور ہمارے روزے سے متاثر ہوسکتی ہیں، یا ان کے سامنے ان اسلامی اخلاق واقدار، اعلی کردار، تجارت ومعاملات اور طرز معاشرت کا عکس اور نقش پیش کرنے کی ضرورت ہے، جس کی اسلام نے زندگی کے ہر دور اور ہر حصے میں رہنمائی اور ہدایت کی ہے۔

بلکہ دوسروں کو متاثر کرنے کی بات ابھی رہنے دی جائے، صرف اپنی حالت پر غور کرلیا جائے، اور سوچا جائے کہ ہم عزت وسربلندی کے کس مقام پر تھے، اور آج ذلت وپستی کے کس غار میں ہیں، آج سے پہلے اور کئی سو سال پہلے جب کہ دنیا کی قومیں تہذیب وتمدن کے نام تک سے ناآشنا تھیں، مسلمانوں کا ذرہ ذرہ نیر تاباں تھا، ان کا ایک ایک فرد اپنی علمی وفکری بلند پروازی سے آسمان پر کمندیں ڈالتا تھا اور جو ذرہ جس جگہ تھا وہیں آفتاب تھا، کبھی تو ہم استاذ اور میدان علم وتحقیق کے شہسوار تھے، اور آج ہم شاگرد کہلانے کے لائق بھی نہیں ہیں، کل پوری دنیا مسلمانوں کی زیر حکمرانی تھی اور آج ہم دوسروں کی ذہنی وفکری غلامی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے اندر ہمت نہیں، حوصلہ نہیں، بلند پروازی نہیں، ہماری کوئی سوچ نہیں، ہماری زندگی کا کوئی مقصد اور نصب العین نہیں، تعلیم وتربیت نہیں، ہماری زندگی میں اخلاق وکردار کی کوئی اہمیت نہیں۔

وضع میں ہو جو نصاری تو تمدن میں یہود ۔۔۔ یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں ہنود

ہم ترقی اور بلندی کی چاہے جتنی باتیں کرلیں، نعرے لگالیں اور مظاہرے کرلیں، احتجاج کرلیں یا سراپا احتجاج بن جائیں، جب ظلم ہو رہا ہو اور ستم ڈھائے جارہے ہوں تو جمہوریت میں جمہوری طریقے سے یہ عمل بھی ضروری ہے، اس سے انکار نہیں۔ لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ مسئلہ ہے حقیقی سربلندی کا، عزت وسرفرازی کا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر دنیا کی رہنمائی اور اس کی قیادت وسیادت کا، اور وہ اس کے بغیر ہرگز ممکن نہیں کہ مسلمان اپنے دین ومذہب کو سمجھیں، اپنے اندر بنیادی تبدیلی پیدا کریں، اور اپنے کو اعلی اخلاق واقدار اور بہترین کیرکٹر اور کردار کا حامل بنائیں، اور اپنی زندگی اس سانچے میں ڈھالیں جس سے اچھا دنیا میں کوئی سانچا نہیں، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ، إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ [البقرة:۲۰۸]

ترجمہ:- اے ایمان والو داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر شیطان کے بیشک وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔

اس سانچے میں خود کو ڈھالنے کے بعد ہی مسلمان بلندی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں، مالک الملک جو سارے جہاں کا خالق اور مالک ہے، اور عزت وذلت دینا جس کے ہاتھ میں ہے، اور وہی ہے جو عزت وسروری عطا کرتا ہے، اس نے اہل ایمان کی عزت وسربلندی کے بارے میں خود ہی فرمادیا ہے کہ ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ [آل عمران:۱۳۹]

ترجمہ:- اور سست نہ ہو اور نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

اس امت کی فلاح وکامرانی کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس راستے کو اختیار کرے جو قرآن کا بتلایا ہوا راستہ ہے، اور اس طریقے کو اپنائے جو پیغمبر اسلام کا تعلیم کیا ہوا طریقہ ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جن کی بزرگی، خداترسی اور جلالت شان پر امت کا اتفاق ہے، انھوں نے فرمایا ہے:

لایصلح آخرُ هذه الأمة إلا بما صلح به أولها.

اس امت کا بعد کا دور بھی اسی چیز سے درست رہ سکتا ہے جس سے اس کا پہلے کا دور بہتر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ۲۲ کا بقیہ

''انسان کی بلند ترین صفت یہ ہے کہ جب مفاد شخصی اور مفاد نوعی واجتماعی میں تصادم ہو تو مفاد نوعی کو مقدم رکھا جائے انسان کی بلند صفت یہ ہے کہ وہ فرض شناسی کو ہر مقام پر مقدم رکھے اگر وہ اس کے کسی نفسانی جذبہ کے خلاف ہو...... حضرت علیؓ نے کبھی اسلامی واجتماعی معاملات میں اپنی ذاتی مخالفت اور نفسانیت دشمنی وعداوت کو دخل نہیں دیا...... بلکہ ہمیشہ امانت ودیانت کے خیال کو ذاتی اغراض ومقاصد اور خیالات وجذبات پر مقدم کیا''

پھر لکھتے ہیں:

''ذاتی اختلاف کے ساتھ مصالح عامہ کی طرف صحیح رہنمائی کرنا وہ صفت ہے کہ جو اضافی اوصاف کا جوہر امتیاز ہے اور وہی امیر المؤمنین کے طرز عمل میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے''۔

(جاری ہے)

تفسیر سورۂ عبس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَبَسَ وَتَوَلّٰی ٥اَنْ جَآءَ ہُ الْاَعْمٰی ٥

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس بات سے کہ آیا اُس کے پاس اندھا

فرمایاعبس: پیغمبر ﷺ نے تیوری چڑھائی اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ''وتولی'' اور منہ موڑا ''ان جاء ہ الاعمی'' اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا۔

اندھے کے واقعے کے ذکر کی وجہ میں مفسرین کا اختلاف:

اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس جگہ نابینا کے آنے کا ذکر کس وجہ سے کیا گیا ہے؟

پہلا قول:۔بعض کہتے ہیں کہ محض بیان واقعہ کے لیے ہے۔

دوسرا قول:۔بعض کہتے ہیں کہ زیادتِ عتاب کے لیے اندھے کے آنے کا ذکر کیا، کہ ہم نے پیغمبر ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنایا ہے، اور رحمت کے زیادہ لائق تو کمزور، ضعیف، فقیر اور اندھے ہیں، اندھے شاگرد رہنمائی کے زیادہ مستحق ہیں، اس قسم کے لوگوں سے منہ موڑنا آنحضرت ﷺ کے مرتبے سے نہایت بعید ہے۔اس کی مثال تو ایسی ہوئی کہ کوئی اپنے خادم سے کہے کہ راستہ بھول جانے والوں کو راستہ بتانا، وہ خادم دیکھنے بھالنے والوں کو تو راستہ بتائے لیکن اندھے نابینوں کی طرف توجہ ہی نہ کرے۔

تیسرا قول:۔بعض نے کہا ہے کہ کمال خفگی کی وجہ سے اس کلام میں آں حضرت ﷺ کو مخاطب بھی نہ فرمایا، کیونکہ اس وقت آنحضرت ﷺ حضرت حق کی مرضی سے غائب ہو گئے تھے، اگرچہ (وہ غیبوبت بھی اس وجہ سے تھی کہ) اس کے بندوں کو اسی کی طرف دعوت دے رہے تھے، لیکن حضرت حق سے غائب کے حکم میں قرار پائے، اس لیے کہ اس وقت حضرتِ حق کے طالبین کے مطلب سے غفلت ہو گئی تھی، اور غائب خطاب کے لائق نہیں ہوتا، پھر جو گلہ شکوہ شروع کیا تو اچھی طرح دھمکانے کے لیے

خطاب فرمایا، جیسے کوئی شخص اپنے مجرم غلام کی شکایت پہلے لوگوں کے سامنے کرتا ہے اور کمال خفگی کی وجہ سے اس کو مخاطب نہیں کرتا، پھر شکایت کرتے کرتے جب جوش میں آتا ہے تو اس غلام کو مخاطب کر لیتا ہے، اور چونکہ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسرا مخاطب نہیں تھا کہ ان کی شکایت اس کے سامنے بیان فرماتے، اس لیے اول ان کی شکایت انہی سے غائب کے صیغے سے بیان فرمائی پھر عتاب آمیز خطاب شروع کیا تا کہ اس انداز سے شدتِ خفگی کی طرف اشارہ ہو۔

محققین کا قول:

محققین کہتے ہیں کہ اس قصے کا یہاں لانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عذر بیان کرنے کی تمہید ہے، اور یہ نہایت ہی رحمت ومحبت کی بات ہے کہ عین عتاب کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر بیان فرماتے ہیں جیسے کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے کی نامناسب بات کی شکایت کرتا ہے اور عین اس شکایت کے وقت اس کا عذر بھی بیان کرتا جاتا ہے، تا کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ لڑکا ناراضگی کے قابل نہیں ہے، لیکن یہ شفقتِ پدری کا کمال ہے کہ بیٹے کے حق میں اتنی سی بات کے لیے بھی راضی نہیں ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی تربیت درجۂ کمال کو پہنچ جائے، اتنی سی بات بھی اس میں نہ رہے۔

عذر کی وجہ یہ ہے کہ گویا یوں ارشاد ہوتا ہے کہ اس پیغمبر کے اخلاق اصلاً اس بات کا تقاضا نہیں کرتے کہ یہ ایسے فقیروں محتاجوں کو جو حق کے طالب اور دین کے راستے کے متلاشی ہیں ان سے اس طرح پیش آئے، لیکن جب ان کو اس سے ناگوار بات پہنچی تو انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ نابینا آدمی ہے یہ تُرشروئی یا خندہ پیشانی میں امتیاز نہیں کر سکتا اس لیے اس کی بے جا حرکتوں سے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، طبیعت پر جبر کر کے اپنے آپ کو اس فعل سے نہیں روکا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کمال رحمت وعنایت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر حذف کر کے فعل غائب کے صیغہ کو بغیر فاعل کے ذکر کیا تا کہ محبوب کی طرف اس فعل کی تصریح نہ ہو، اور یوں ارشاد ہوتا ہے کہ ''تیوری چڑھائی اور منہ موڑا ایک تیوری چڑھانے والے اور منہ موڑنے والے نے'' اگر خطاب کا صیغہ لاتے تو محبوب کی طرف اس فعل کی نسبت صراحتاً ہوتی اور یہ کمال رحمت وشفقت کے خلاف ہے، عین شکایت وعتاب کے دوران بھی لطف ومحبت کی رعایت کیے چلے جا رہے ہیں۔

اور بعض نے کہا کہ اندھے کی تعلیم مشکل ہے چونکہ وہ فقط یاد کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہے، لکھی

ہوئی چیز کی طرف مراجعت اس سے ممکن نہیں، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عذر اس طرح بیان ہوا کہ آپؐ نے اس اندھے کو کم استعداد جان کر اس سے منہ پھیرا اس لیے آپ معذور ہیں لیکن درحقیقت آنکھوں کا اندھا پن منہ پھیرنے کا سبب نہیں دل کا اندھا پن منہ پھیرنے کا سبب ہونا چاہئے، اور وہ امیر و سردار سب دل کے اندھے تھے لہذا آپ کے لیے مناسب تو یہ تھا کہ ان سے منہ پھیرتے نہ کہ اس آنکھوں کے اندھے سے کیونکہ دل کا بینا ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ ۝

اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا

یعنی آپ کو کیا معلوم شاید وہ اندھا پاک ہو جائے، اور اس کے دل کا آئینہ ایسا صاف ہو جائے کہ یہ آنکھوں والے امور غیبیہ، کشفیہ میں سے جو کچھ نہیں دیکھ سکتے وہ دیکھے، اور ایک عالم کا مقتدا ہو جائے، اندھا ہونے کے باوجود ہزاروں آنکھوں والوں سے بہتر ہو جائے، اسی لیے کہا گیا ہے ؎

فدائے کوری خفاش چشم بینائے
کہ بے خبر ز رخ آفتاب نیم شی است

أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ ۝

یا سوچتا تو کام آتا اس کے سمجھانا

یعنی اگرچہ قلب صیقل کے مرتبے کو نہ پہنچے لیکن قرآن کے معانی، امر و نہی اس کے دل میں اس طرح پختہ ہو جائیں کہ وہم و خیال کی آمیزش اس میں نہ رہے۔

پس نصیحت پکڑنا اس کو نفع دے جس کی وجہ سے دین کی عمدہ عمدہ منفعتیں حاصل کرے، ضرر پہنچانے والی چیزوں سے اپنے کو بچائے، اس کا لطیفۂ عقل روشن ہو کر عالمِ ربانی بن جائے اور ہزاروں آنکھوں والوں سے بہتر ہو جائے جیسا کہ شقِ اول (تزکیہ) میں اس کا لطیفۂ قلب صاف ہو کر اس کو صاحب عرفان اور صاحبِ کشف ولی کا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے۔

''یزکیٰ'' اور ''یذکر'' کے درمیان کلمۂ ''او'' لانے کی وجہ:

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے دیکھنے والوں کو اس اندھے کے بارے میں

دونوں شقوں (تزکیہ یا تذکر) میں سے کسی ایک کا یقینی طور پر حاصل ہونا معلوم نہیں تھا اس لیے کلمۂ ''او'' لائے جو شک اور مانعۃ الخلو پر دلالت کرتا ہے، لیکن اس نابینا کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض حاصل کرنے کا کمال شوق وکثرتِ حرص، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے انسیت اور قرآن کریم کی تلاوت، اس کے معانی کے اندر غور وتأمل سے اس قدر سب کو یقین تھا کہ یہ ضرور کچھ نہ کچھ بن کے رہے گا، دونوں مرتبوں سے بالکل محروم نہ ہوگا۔

صاحب کشاف بھی ''او'' کے مدلول پر متنبہ ہوکر اپنی تفسیر میں اس بات کو بطور سوال لایا ہے (سوال یہ اٹھایا) پاک ہونے سے زیادہ نصیحت کا کون سا نفع متوقع ہے (کہ نصیحت سے نفع اٹھانے کو تزکیہ پر تشکیک کے ساتھ لائے)

جواب یہ لکھا ہے کہ تزکیہ نام ہے تقویٰ اور گناہوں سے بچنے کا، اور تذکر (نصیحت کا نفع کرنا) نام ہے طاعات کے بجالانے کا اور طاعات سے ثواب کی امید ہے اور ثواب دائمی منفعت ہے، (لہذا الگ الگ چیزیں ہوئیں)

ایک اور اعتراض اور اس کا جواب:

لیکن یہاں ایک اور اعتراض ہوتا ہے کہ علم حاصل ہوجانے سے یہ دونوں چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں، گناہوں سے بچنا بھی اور عملِ طاعت کا کرنا بھی، لہذا یہ ''واؤ'' کا مقام تھا ''او'' کا نہ تھا۔

اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ طالب علم کو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کیا سنے گا، اگر نہی سنے گا تو گناہ سے باز رہے گا، امر سنے گا تو طاعت میں اضافہ کرے گا اور اگر دونوں سنے گا تو دونوں کام کرے گا، لہذا یہاں او کو مانعۃ الخلو کے طور پر لائے نہ کہ مانعۃ الجمع کے طور پر، یہ ایک توجیہ ہے اور حق بات وہی ہے جو اولاً مذکور ہوئی۔

اَمَّامَنِ اسْتَغْنٰی۝

وہ جو پروا نہیں کرتا

یعنی جو شخص آپ کے ارشاد اور آپ کی راہ سے بے پرواہی کرتا ہے اور اپنے مال وجاہ پر ریجھ رہا ہے۔

فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ۝

سوتو اس کی فکر میں ہے

یعنی آپ اس کی ہدایت کے در پے ہیں اور شوقین شاگردوں سے منہ موڑتے ہیں، اس خیال سے کہ جو بے پرواہ ہے اس کو اس راہ کا طالب اور شوقین کرنا چاہئے، اور جو طالب شوقین ہے اس کے لیے تو شوق ہی راہبر ہے وہ آخر کار اپنے مقصد کو حاصل کرلے گا۔

وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ۝

اور تجھ پر کچھ الزام نہیں کہ وہ نہیں درست ہوتا

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی الزام نہیں کہ وہ لاپرواہ پاک کیوں نہ ہوا کیونکہ آپ کا کام تو احکام الٰہی کا پہنچانا، مستعد اور شوقین لوگوں کی تربیت کرنا ہے سو یہ بات آپ کو حاصل ہے چاہے یہ لاپرواہ لوگ قبول کریں یا نہ کریں۔

وَاَمَّا مَنْ جَاءَکَ یَسْعٰی ۝

اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا

یعنی جو شخص محنت کے ساتھ آپ کے پاس دوڑا آتا ہے، جیسا کہ یہ نابینا ہے کہ ہاتھ پکڑنے والا بھی نہیں رکھتا، اور ٹھوکریں کھاتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تھا۔

وَھُوَیَخْشٰی ۝

اور وہ ڈرتا ہے

یعنی اول تو خدائے تعالی سے ڈرتا ہے کہ کہیں اللہ تعالی کی مرضیات سے دور نہ ہوجائے اور منہیات میں مبتلا نہ ہوجائے، اور یہی خوف اس کے لیے علم حاصل کرنے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں پہنچنے کے شوق کا سبب ہے، پھر راستے میں کافروں کی ایذا رسانی سے بھی ڈرتا ہے کہ مبادا ان کو اطلاع ہوجائے اور وہ تکلیف دیں، اور گرنے ٹھوکر کھانے سے بھی نہیں ڈرتا، پھر آپ کے پاس جب حاضر ہوتا ہے تو اپنے سبق کے فوت ہوجانے سے بھی ڈرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ آں حضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کہیں مشغول ہوں اور میں استفادہ سے محروم ہو جاؤں۔

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ○

سوتو اس سے تغافل کرتا ہے

یعنی پھر آپ اس سے منہ پھیر کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے حال کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، گویا کلی فائدہ آپ اسی میں دیکھتے ہیں کہ بے پرواہوں اور بھاگنے والوں کو تابعدار بنائیں، اور ہدایت کی طرف لائیں، اور مشتاقین، سچے طالبین کو تاخیر سے کمال شوق میں مضطرب رکھیں۔

كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ○

یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے

یعنی یہ آیاتِ قرآنی اللہ تعالی اور اس کے اسماء، اس کی صفات، افعال، احکام اور ان کی جزاؤں کے یاد کرنے کے واسطے ہیں، تاکہ لوگوں کے لیے معرفت، عبادت، محبت، خوف اور رجاء کی راہ کھل جائے اور اللہ کی اس راہ پر چلنا اختیار کریں، اس بات میں التجاء اور منت وزاری مفید نہیں بلکہ (طالب کے) دل کے اختیار اور اس کی طبعیت کی رغبت درکار ہے۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ○

پھر جو کوئی چاہے اس کو پڑھے

یعنی جو شخص سچی طلب رکھتا ہے وہ اس قرآن کو پڑھے، کہ حقیقت میں یہ ذکر اللہ ہے، اور ذکر الٰہی بغیر دل کی رغبت اور صدقِ ارادت کے مفید نہیں ہوتا۔

''انها'' میں ضمیر مؤنث اور ''ذکرہ'' میں مذکر لانے کہ وجہ:

''انھا'' میں ضمیر مؤنث، ''ذکرہ'' میں مذکر ہے، حالانکہ مرجع دونوں کا ایک ہے یعنی ''قرآن''۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن کا تذکرہ ہونا آیتوں اور سورتوں کے اعتبار سے ہے، ہر ایک آیت الگ الگ مضمون رکھتی ہے بعض میں اسماء وصفات کا بیان ہے، بعض میں احکام وشرائع کا، اور بعض میں وعدہ ووعید ہے۔

اور قرآن کا ''ذکر'' ہونا اس کی وحدانیت کے اعتبار سے ہے کہ تمام قرآن اس میں برابر

ہے، اس کے ''ذکر'' ہونے میں مضامین کے اختلاف کا کچھ دخل نہیں، اس لیے کہ کوئی سا مضمون ہو سب کلام الٰہی ہے، (حاصل یہ ہوا کہ ہا مؤنث کی ضمیر آیات وسورت کے لحاظ سے ہے اور ذکـــرہ کی مذکر ضمیر قرآن واحد مذکر کے لحاظ سے ہے)

کلام اللہ کے افضل الذکر ہونے کی عجیب توجیہ:

نام کا اتصال جتنا مسمیٰ سے ہوتا ہے، کلام کا اتصال متکلم کے ساتھ اس کی نسبت اقوی واشد ہے، اور جو التفات وتوجہ کسی کا نام لیتے وقت اس کی طرف ہوتی ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو توجہ اس کا کلام پڑھتے وقت اس کی طرف ہوتی ہے، چنانچہ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے نیز کسی بھی شخص کا کلام اس کی ذات کی علامات ونشانات میں ایک بہترین علامت ونشان ہے (جس سے اس کی ذات کی یاد تازہ رہتی ہے) چنانچہ کلام پڑھتے ہوئے اس کی ذات دل پر روشن ہو جاتی ہے، اسی لیے بزرگوں کا نام لینے کے مقابلے میں ان کا کلام زیادہ دل پر اثر کرتا ہے، اسی وجہ سے حدیث میں کلام اللہ کے متعلق آیا ہے ''**هو حبل الله المتين**'' (وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے) اور امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا ''**تجلى الله لعباده فى كلامه ولكنهم لا يبصرون**'' (اللہ تعالی نے اپنے بندوں کے لیے اپنے کلام میں اپنی تجلی ظاہر کی ہے لیکن لوگ اس کو نہیں دیکھتے)

ایک شبہے کا جواب:

(آنے والی آیت ایک شبہے کا دفعیہ کرتی ہے) اگر کسی کے دل میں یہ شبہہ گذرے کہ جب دنیاوی لحاظ سے بڑے لوگ، سرمایہ دار، سردار اور دولت مند جب کسی کتاب، یا کلام وغیرہ کی طرف شوق کرنے لگتے ہیں تو اس کی عزت وقدر لوگوں میں بڑھ جاتی ہے، پھر اس کتاب کو لکھنے والے (چھاپنے والے) اس کو بہت عمدہ کاغذ، عمدہ کتابت، اور قیمتی جلد میں مجلد کرتے، بلکہ اس کو سنہری حروف میں لکھتے ہیں (چونکہ اس کی قدر واہمیت بڑھ جاتی ہے) اس طرح اس کلام کا مرتبہ بڑھ جاتا ہے اور اس کی عظمت لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہو جاتی ہے، جیسے دلچسپ شعر اگر خوش آوازی سے پڑھا جائے تو زیادہ اثر کرتا ہے لیکن جلدی جلدی پڑھ لیا جائے تو وہ اثر اس کا نہیں ہوتا۔

لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی امراء وسرداروں کو دعوت دینے میں مشغول تھے اور اس وقت فقراء سے انھوں نے منھ پھیرا تو یہی وجہ ہوگی، (لہذا اس پر عتاب نہ ہونا چاہئے تھا)

ہم کہتے ہیں کہ یہ قرآن اس قسم کا نہیں کہ ان چیزوں سے اس کی عزت وقدر میں اضافہ ہو،

بلکہ اس کی عزت وقدر اس اعتبار سے دیکھنی چاہئے کہ کہاں سے یہ نازل ہورہا ہے، چنانچہ فرمایا:

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝

لکھا ہے عزت کے ورقوں میں

یعنی قرآن کی آیات عزت والے اوراق میں لکھی گئی ہیں یعنی حق تعالی نے خود ان کی عظمت بڑھائی ہے۔

مَّرْفُوْعَةٍ

اونچے رکھے ہوئے

یعنی وہ صحیفے اونچے رکھے گئے ہیں، ''بیت العزت'' کے اندر، بیت العزت آسمان دنیا میں ایک مقام ہے جہاں سب سے پہلے قرآن کریم لوحِ محفوظ سے نقل کرا کر رکھا گیا، وہاں سے تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔

مُّطَهَّرَةٍ ۝

نہایت ستھرے

یعنی وہ صحیفے تمام گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک کئے گئے ہیں، اگر دنیا کے سردار دولتمند لوگ قرآن کی آیتوں کو طلائی اور حریری کاغذ پر لکھوادیں، ایسے ہی رحلوں اور صندوقوں پر رکھ دیں تب بھی قرآن اس عظمت و بلندی کے مرتبہ کو نہ پاسکے گا، اسی طرح اگر دنیا والے اس کو عطر وخوشبو میں ڈبو دیں اور نجاستوں سے دور رکھیں تب بھی وہ پاکیزگی کے اس درجہ کو نہیں پہنچے گا، اس لیے کہ وہاں کوئی گنہگار ہاتھ اس تک نہیں پہنچتا بلکہ وہ اوراق:

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝

ہاتھوں میں لکھنے والوں کے جو بڑے درجے والے نیک کار ہیں

یعنی وہ صحیفے ایسے ہاتھوں کو سونپے گئے ہیں کہ وہ ہاتھ لکھنے والے بڑی قدر والے نیکوکار ہیں، ان سے نیکی کے سوا کبھی کسی اور بات کا ظہور نہیں ہوتا، جب کہ دنیا کے لکھنے والے گناہوں اور ذاتی خباثتوں سے آلودہ ہیں اگر چہ اپنا ظاہر وہ آراستہ رکھیں اس سے کیا حاصل، لہذا قرآن کے بارے میں دنیاداروں کی رغبت، ان سے عزت وقدر کی توقع رکھنا بے جا ہے (اول تو اس کی ضرورت ہی نہیں اور توقع بھی نہیں ہے) بلکہ دنیادار

لوگ اگراس کی قدر کریں تو غنیمت ہے کیوں کہ انسان کے مزاج میں کُفرانِ نعمت ہے، چنانچہ فرمایا:

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ ○

مارا جائیو آدمی کیسا ناشکرا ہے

یعنی ہلاک ہو انسان کیسا ناشکرا ہے، کہ جس نے اس عظیم القدر کلام سے اس کو نوازا اس کے اندر طرح طرح کی ہدایات وارشادات اس کے لیے بیان فرمائے مگر اس کو خبر ہی نہیں، اور نہ اس کے حقوق ادا کرتا ہے الٹا اپنے مال وجاہ پر مستغنی و بے نیاز ہوا بیٹھا ہے، بلکہ وہ تو اپنی اصل کی بھی خبر نہیں رکھتا کہ وہ کیا تھا۔

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ ○

کس چیز سے بنایا اس کو

یعنی کس حقیر چیز سے اس کو پیدا کیا، اگر انسان اس سوال کا جواب دینے سے شرماتا ہے تو ہم بتا دیتے ہیں:

مِنْ نُّطْفَۃٍ ط خَلَقَہٗ

ایک بوند سے، بنایا اس کو

یعنی نطفے کی بوند سے اس کو پیدا کیا جو ایک پیشاب کے راستے سے نکلا اور دوسرے پیشاب کے راستے میں چلا گیا، پھر خون اور نجاستوں سے مل کر گوشت کا ٹکڑا بن گیا۔

فَقَدَّرَہٗ ○

پھر اندازہ پر رکھا اس کو

یعنی اس کے اعضاء، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ناک، قد وقامت بھی مقرر کئے اور رزق، زندگی، موت اور نیک و بد عمل بھی اس کے متعین کر دیئے اس کے ساتھ ماں کے پیٹ کے اندر رہنے کی مدت بھی نو مہینے یا کم وبیش متعین کی۔

ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَہٗ ○

پھر راہ آسان کر دی اس کو

یعنی پھر اس کو نکلنے کا راستہ آسان کر دیا، کیونکہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس کا سر

ماں کے سر کی طرف اور پاؤں ماں کے پاؤں کی طرف ہوتے ہیں، پھر جب پیدا ہونے کا وقت قریب آتا ہے تو اس کو الہام ہوتا ہے وہ فوراً پھر جاتا ہے اور سر نیچے کی طرف اور پاؤں اوپر کی طرف کر لیتا ہے تاکہ نکلنا آسان ہو جائے، پھر جب ماں کے پیٹ سے باہر آجاتا ہے تو معاش کی راہ اس کے لیے آسان کر دی جاتی ہے۔

اس طرح کہ ماں کا پستان ہاتھ میں آجائے تو وہ مضبوطی سے پکڑ کر پینا شروع کر دیتا ہے، اور رونے دھونے سے اپنے بھوکا ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح سال بسال اس کے لیے راہیں آسان کر دی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے، اور انبیاء کرام کے بھیجنے، کتابوں کے نازل کرنے، شفیق مرشدوں کی صحبت اور محقق علماء کی شاگردی کے ذریعہ سے اس کے لیے اچھی بُری، اور حق و باطل کی راہ میں تمیز آسان کر دی جاتی ہے۔

پھر بعض کے لیے نجات و جنت کی راہ آسان کر دی جاتی ہے وہ اس پر چلنے کی توفیق پاتے ہیں اور بعض کو ہلاکت و دوزخ کی راہ آسان نظر آتی ہے وہ اس پر چل پڑتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ آخر عمر تک اس کے لیے کمالات کا حاصل کرنا آسان کر دیا جاتا ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ ○

پھر اس کو مردہ کیا

پھر اس کو موت دیتا ہے تاکہ دنیا کے اندر کمالات حاصل کرنے کے لیے اس نے جو محنتیں اٹھائی تھیں ان کا پھل پائے اور عالمِ برزخ میں اپنے اعمال کی نشانیاں دیکھے۔

موت ایک نعمت ہے:

موت بھی ایک بڑی نعمت ہے کہ تجارت (اخروی) کا فائدہ اسی (موت کے) سفر کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے ورنہ اگر موت نہ ہوتی تو آدمی ہمیشہ اعمالِ شاقہ کی کش مکش میں گرفتار رہتا اور اپنی مشقت کا پھل نہ پا سکتا، اسی وجہ سے اس مقام پر نعمتوں کو گنتے ہوئے موت کو بھی ذکر کیا ہے چنانچہ بزرگوں سے منقول ہے: "**الموت جسر یوصل الحبیب إلی الحبیب**" "موت ایسا پُل ہے جو ایک دوست کو دوسرے دوست تک پہنچا تا ہے"

ارشاد الثقلین

بجواب اتحاد الفریقین

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

(دوسری قسط)

شیعوں کے سید العلماء سے دودو باتیں آپ کے اطمینان کے لیے میں مولوی علی نقی صاحب کی توجیہ آپ کے سامنے پیش کر کے اس کی حقیقت بے نقاب کرتا ہوں، ضمیمہ اتحاد الفریقین ص۱۱۲ملاحظہ کیجئے۔

پہلی سخن سازی سید العلماء صاحب کی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دماغ سے یہ افسانہ تراشا کہ سرداران لشکر وغیرہ نے حضرت عمرؓ کو جنگ کی شرکت کے لیے پریشان کیا............اور حضرت عمرؓ ان کے اصرار سے پریشان ہوئے تو انھوں نے حضرت علی سے مشورہ لیا۔

کیا کوئی شیعہ عالم بتا سکتا ہے کہ یہ خالص تاریخی بات سید العلماء نے تاریخ کی کس کتاب سے اخذ کی ہے؟ کیا سید العلماء کو آج تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ تاریخی امور قیاس کی دسترس سے باہر ہیں؟ اللہ اللہ مجتہدین شیعہ کا یہ حال ہے، تا بدیگراں چہ رسد۔

دوسری سخن سازی جس سے سید العلماء صاحب کے مبلغ علم وفہم پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے یہ ہے کہ حضرت علی کے ان الفاظ

ومکان القیم بالامر مکان النظام من الخرد یجمعه ویضمه فان انقطع النظام تفرق الخرد وذهب ثم لم یجتمع بحذافیره ابداً

اور قیم بالامر یعنی خلیفہ کی وہ حیثیت ہوتی ہے جو ہار کے دانوں میں دھاگے کی ہوتی ہے کہ وہ دھاگا ان سب دانوں کو جمع کیے ہوئے اور ملائے رہتا ہے اگر دھاگا کٹ جائے تو سب دانے منتشر ہو جائیں گے

اور جاتے رہیں گے پھر کبھی اپنی پہلی وضع پر جمع نہ
ہوں گے۔

کا ترجمہ کر کے لکھا ہے: ''یہ حضرت نے ایک کلیہ کی صورت سے ارشاد فرمایا ہے لہذا اس سے یہ نتیجہ بالخصوص نہیں نکالا جا سکتا کہ حضرت علی نے حضرت عمر کی ذات والا صفات کو مسلمانوں کا مایۂ نظام فرمایا کہ یہ نظام آپ کے بعد قیامت تک پھر کبھی نہ ہوگا، اس لیے کہ آپ قیم بالامر ہیں، یہ نتیجہ تو جب نکلتا جب حضرت خصوصیت کے ساتھ فرماتے کہ آپ کی مثال وہ ہے جو رشتہ کو موتیوں کے ساتھ ہوتی ہے''۔

سید العلماء کے اس کلام کی سخافت محتاج بیان نہیں ہے، اول یہ محض بے دلیل بات ہے کہ حضرت علی کا یہ کلام ایک کلیہ کی صورت میں ہے، القیم کا الف ولام جس طرح جنس کے لیے ہوسکتا ہے عہد کے لیے بھی تو ہوسکتا ہے۔ ثانیاً اگر اس کلام کو کلیہ بھی مان لیا جائے، تو سوال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس کلیہ میں داخل ہیں یا نہیں؟ اگر کہئے کہ داخل نہیں ہیں، تو حضرت علی کا یہ کلام لغو اور بے تعلق ہو جائے گا، اس لیے کہ جب حضرت عمر قیم بالامر نہیں ہیں تو قیم بالامر کی حیثیت اور اس کی مثال بیان کرنے سے یہاں کیا فائدہ؛ اور اگر حضرت عمرؓ کو اس کلیہ میں داخل مانئے تو مذکورۂ بالا نتیجہ سے انکار ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت عمرؓ کو اس کلیہ میں داخل ماننے کی یہی صورت ہے کہ ان کو قیم بالامر تسلیم کیجئے اور چونکہ قیم بالامر ہی کو حضرت علی نے مایۂ نظام کہا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ اس کے بعد یہ نظام پھر کبھی نہ ہوگا۔ اس نتیجہ سے سید العلماء صاحب کے انکار کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ **زید انسان و کل انسان حیوان** سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ زید حیوان ہے، اس لیے کہ یہ نتیجہ تو جب نکلتا جب کہ ہر انسان کو حیوان کہنے کے بجائے خصوصیت کے ساتھ زید کو حیوان کہا گیا ہوتا، بتائیے کہ اس کہنے والے کو مبادی منطق اور اصول استنتاج سے نا آشنائے محض بلکہ عقل و فہم سے بیگانہ کہنے کے سوا اور کیا جواب دیا جا سکتا ہے۔

حضرت علیؓ کا یہ کلام بھی قیاس منطقی کی شکل اول کی وضع پر ہے جس کا صغری بوجہ غایت ظہور و وضوح ہے، قرینۂ حالیہ پر اعتماد کر کے ذکر نہیں کیا گیا اور قرآن و حدیث اور محاورات روزمرہ عموماً یہی معمول بہ ہے، پس تقدیر کلام یہ ہے **انت القیم بالامر و القیم بالامر مکانه مکان النظام من الخرد** اور ہر مبتدی بھی جانتا ہے کہ اس قیاس کا نتیجہ بجز **انت مکانک مکان النظام من الخرد**

کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا اور اس کا صریح مفہوم یہ ہے کہ ''آپ کی مثال وہ جو رشتہ کو موتیوں کے ساتھ ہوتی ہے''، پس یہ کہنا کہ حضرت علی کے کلام سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا، منطق کے ابتدائی مسائل اور عرف ومحاورہ سے بے خبری، یا صریح مکابرہ ہے۔

خیر! اگر سید العلماء صاحب ان چیزوں سے بے خبر تھے تو چنداں مضائقہ نہیں، لیکن حیرت ہے کہ کیا وہ امامت علی کے ان دلائل واہیہ سے بھی بے خبر ہیں جو ہر شیعہ مولوی کو ازبر یاد کرائے جاتے ہیں، مثلاً آیت ولایت یعنی **انما ولیکم الله ورسوله** الآیۃ شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی کی امامت وولایت کے باب میں نص صریح ہے۔ اگرچہ شیعوں کا یہ قول محض غلط ہے لیکن مجھے یہاں اس سے بحث نہیں، مجھے تو صرف یہ دکھانا ہے کہ آیت میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے، وہ ایک کلیہ کی صورت میں ہے، بایں ہمہ شیعہ اس سے خصوصیت کے ساتھ حضرت علی کے استحقاق امامت کا نتیجہ نکالتے ہیں، لیکن سید العلماء کے نقطۂ نظر سے شیعوں کا یہ استدلال غلط ہے تاوقتیکہ خصوصیت حضرت علی کا نام نہ لیا جائے، یا ان کو خطاب کرکے نہ کہا جائے اس آیت سے ان کی امامت ثابت نہیں ہوسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے اس کلام نے شیعوں کو بدحواس کردیا ہے، کوئی بات بنائے نہیں بنتی، ''سید العلماء'' نے اس کے بعد لکھا ہے:

''بیشک کلیۃً ایسا ہی ہے کہ ہر بادشاہ اپنے زیر حکومت رعایا کے لیے باعث انتظام وشیرازہ بندی ہوتا ہے اور اگر وہ ہٹ جائے تو شیرازہ منتشر ہوجائے گا، اور جب تک پھر کوئی بحیثیت بادشاہ اس شیرازہ کو مجتمع نہ کرے وہ مجتمع ہو نہیں سکتا۔'' (ص۱۱۳)

حضرت عمر کی خصوصیت وفضیلت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ توجیہ بہت اچھی تھی، لیکن افسوس کہ زیر خط عبارت جس پر اس توجیہ کا سارا دارومدار ہے اس کا کوئی اشارہ کلام علی رضی اللہ عنہ میں موجود نہیں ہے، بلکہ اس میں تصریح کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے، کہ پھر کبھی ابد تک وہ شیرازہ مجتمع نہیں ہوسکتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کو جناب امیر عام بادشاہوں سے اس وصف میں ممتاز قرار دیتے ہیں کہ ان کے بعد دوسرا قیم بالامر بھی کھڑا ہوجائے تو موجودہ شیرازہ بندی ممکن نہیں ہے۔

سید العلماء کی تیسری سخن سازی یہ ہے کہ جناب امیر کے اس فقرہ میں کہ **فانک إن شخصت من هذه الأرض انتقضت علیک العرب من أطرافها وأقطارها.**

''یعنی اگر آپ اس سرزمین سے اٹھے تو تمام عرب ہر چہار طرف سے آپ پر ٹوٹ پڑیں گے۔'' یہ اضافہ کردیا کہ ''جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے۔''

سید العلماء کا یہ منشاء اس کارروائی سے ہے، ظاہر کرتا ہے کہ حضرت علی نے یہ اپنا خیال بیان نہیں کیا ہے بلکہ سرداران لشکر کے خیال کی ترجمانی کی ہے، اور یہ کارروائی سید العلماء نے اس لیے کی ہے تا کہ حضرت امیر کے اقرار سے حضرت عمر کے ساتھ مسلمانوں کی جاں نثاری اور محبت کا ثبوت نہ ہو سکے، لیکن مجھے سید العلماء کی اس سادہ لوحی پر تعجب آتا ہے کہ وہ اتنا بھی نہیں سمجھے کہ دنیا ایسی بے وقوف نہیں ہوگئی ہے، کہ وہ ان کے اس بے دلیل و بے بنیاد دعوی کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرلے، جب کہ متکلم یعنی حضرت علی کے کلام میں ایسا کوئی لفظ کیا معنی کوئی قرینہ بھی نہیں ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ غیروں کے خیالات کی ترجمانی کررہے ہیں، نیز تاریخوں میں بھی یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ سرداران لشکر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔

سید العلماء کی چوتھی سخن سازی یہ ہے کہ جناب اس فقرہ

ان الاعاجم ان ینظروا الیک غداً یقولوا ھذا اصل العرب فاذا قطعتموہ استرحتم	عجمی لوگ جب کل آپ کو میدان جنگ میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ شخص عرب کی جڑ ہے، اگر اس کو کاٹ ڈالو گے تو ہمیشہ کے لئے آرام پا جاؤ گے۔

کا ترجمہ کر کے لکھتے ہیں۔ ''ایک بہادر کے جوش وولولہ کے لیے یہ الفاظ تازیانہ کا کام کرسکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر محتاط تھے، حضرت علی نے جو یہ پہلے پیش کردیا تو آپ نے خود جنگ میں جانے کا خیال ترک فرمادیا''۔

میں سید العلماء سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے حضرت عمر کی جانب جس ''احتیاط'' کی نسبت کی ہے اگر وہ کوئی قبیح چیز تھی تو معاف کیجئے گا کہ اس کے ارتکاب کا سارا الزام جناب امیر پر ہے اس لیے کہ حضرت عمر مدینہ سے کچھ دور بارادۂ شرکت جنگ جا چکے تھے، لیکن حضرت امیر نے بقول آپ کے مذکورۂ بالا بات کہہ کر روک دیا اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ صاف لفظوں میں یہ بھی کہا کہ ''آپ اپنی جگہ پر قطب کی طرح قائم رہئے'' کہ بجائے حضرت عمر کے حضرت علی کو نشانۂ ملامت وہدف تشنیع بنائیے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے طور پر عافیت پسندی کے خلاف شرکت جنگ کا ارادہ کیا، اور گھر سے

نکل کھڑے ہوئے لیکن موافق حکم الٰہی وامرھم شوری بینھم (قرآن مجید پ۲۵ ع۴) صحابۂ کبار سے مشورہ لیا، اور جب حضرت علی وعباس وطلحہ وعثمان رضی اللہ عنہم نے ارادہ فسخ کرنے کا مشورہ دیا تو اسی حکم قرآنی کے ماتحت مدینۂ منورہ میں واپس آ گئے۔ پس اس پر ''احتیاط پسندی'' کا آوازہ کسنا تعصب وتنگ نظری ہے، ہاں یہ البتہ ''احتیاط پسندی'' ہے کہ بہ تصریح مسعودی (شیعہ) جب حضرت علی سے اسی موقع پر قیادت لشکر کے لیے کہا گیا اور شرکت جنگ کی درخواست کی گئی تو **ابی ذلک علي و کرھه** یعنی حضرت علی نے صاف انکار کر دیا اور ضد کی اور اس کو ناگوار سمجھا۔

(دیکھو مسعودی ص ۱۱۷ ج ۵)

سید العلما کی پانچویں سخن سازی یہ ہے کہ مشورۂ حضرت امیر کا یہ اخیر فقرہ ''اور جو آپ نے ان کی کثرت بیان کی تو بات یہ ہے کہ ہم لوگ زمانۂ گذشتہ میں اپنی کثرت کے بھروسہ پر جنگ نہ کرتے تھے بلکہ خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے لڑتے تھے'' لکھ کر فرمایا:

''طرز کلام سے ظاہر ہے کہ یہ حقائق الٰہیہ مخاطب کے پیش نظر نہ تھے اور حضرت علی ان کے اوپر خاص طور سے توجہ دلا رہے ہیں'' ص ۱۱۵

سید العلماء کی یہ خوش فہمی محل حیرت ہے، سید العلماء کے خیال میں جب کوئی شخص کسی کو کوئی مشورہ دے یا کسی پریشانی کے وقت میں اس کی تسلی ودلدہی کے کلمات کہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ مخاطب کو وہ باتیں معلوم نہیں ہیں جن کو مشورہ دہندہ یا تسلی دہندہ بیان کرتا ہے، فرض کیجئے کہ سید العلماء کے گھر کوئی حادثہ ہو جائے اور لوگ آپ کے گھر تعزیت کے لیے آ کر تسلی بخش کلمات کہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی ناپائیداری اور صبر کے فضائل سید العلماء کے پیش نظر نہیں ہیں، اس لیے لوگ ان حقائق کے اوپر سید العلماء کو خاص طور پر توجہ دلاتے ہیں، سبحان اللہ! کیا کہنا ہے سید العلماء کی منطق کا!

اچھا جناب سید العلما! حیات القلوب ج ۲ ص ۶۲۸ میں لکھا ہے:

طبرسی از امام محمد باقر روایت کردہ است کہ چوں حضرت رسول نظر کردہ بسوئے بسیاریٔ عدد مشرکان وکمی عدد مسلمانان رو بقبلہ آورد دست	طبرسی نے امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ جب رسول خدا ﷺ نے مشرکوں کی زیادتی اور مسلمانوں کی کمی کو دیکھا تو قبلہ رو ہو کر دعا

بدعا برداشت وگفت کہ پروردگار وفا کن بوعدہ کہ بامن کردی خداوندا اگر ایں گروہ ہلاک شوند کسی عبادت تو درز مین نخواہد کرد وپیوستہ دست بجانب آسمان بلند کردہ بود وتضرع می نمود تا آنکہ ردا از دوش مبارکش افتاد پس حق تعالی ایں آیہ فرستاد، وما جعله اللّٰه الا بشریٰ لکم ولتطمئن به قلوبکم وما النصر الا من عنداللّٰه ان اللّٰه عزیز حکیم.

کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ اے پروردگار اپنا وعدہ مجھ سے پورا کر، اے خدا اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین پر کوئی تیری عبادت نہ کرے گا آنحضرت ﷺ برابر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے دعا وتضرع کرتے رہے یہاں تک کہ چادر آپ کے دوش مبارک سے گرگئی، پس حق تعالی نے یہ آیت بھیجی (اور انھیں بتایا، اس کو (نزول ملائکہ کو) اللہ نے مگر خوشخبری تمھارے لیے تا کہ تمھارے دل مطمئن ہوں اور نہیں ہے مدد، مگر اللہ کے پاس سے بیشک اللہ عزت اور حکمت والا ہے)

کیا یہاں بھی آپ یہی کہیں گے کہ جو حقائق الٰہیہ اس تسلی دینے والی آیت میں مذکور ہیں، وہ مخاطب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیش نظر نہ تھے اس لیے ان کے اوپر خصوصیت سے توجہ دلائی گئی ہے؟

مشورہ غزوۂ روم

نہج البلاغہ میں ایک دوسرا مشورہ بھی مذکور ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو جنگ روم کے موقع پر دیا ہے، ''ابوالائمہ کی تعلیم'' میں اس مشورہ کو نقل کر کے لکھا گیا ہے کہ اس سے حسب ذیل قیمتی نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱:- حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کو اپنا محبّ مخلص جانتے تھے، مشورہ اسی سے طلب کیا جاتا ہے جس کی محبت واخلاص پر پورا پورا اعتماد ہوتا ہے۔

۲:- حضرت علیؓ نے اس دین کے متعلق جو حضرت عمرؓ کا اور تمام صحابہ کا تھا فرمایا کہ اللہ اس کی عزت کا ذمہ دار ہے، اور اس دین والوں کی خدا نے بے سروسامانی میں مدد کی، وہ خدا اب بھی موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ کے نزدیک حضرت عمرؓ کا اور تمام صحابہؓ کا دین وہی تھا، جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے، کیونکہ یہ سب اوصاف اسی دین کے ہیں۔

۳:-حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کی ذات اقدس کو بے مثل و بے نظیر جانتے تھے اور ان کا یہ اعتقاد تھا کہ حضرت عمرؓ کے بعد مسلمانوں کو روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

۴:-حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کا مددگار اور ملجا و ماویٰ فرمایا۔

۵:-حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو میدان جنگ میں جانے سے روکا کہ مبادا وہ شہید نہ ہو جائیں۔ اگر بقول شیعہ حضرت علیؓ کو ان سے عداوت ہوتی تو روکنے کے بجائے میدان جنگ میں جانے کی ترغیب دیتے اور ان کی شہادت کو مسلمانوں کے لیے راحت تصور کرتے۔

اس مشورہ اور اس کے مذکورۂ بالا نتائج کی نسبت بھی مصنف اتحاد الفریقین نے اس سے زائد کوئی بات نہیں لکھی جو انھوں نے مشورۂ غزوۂ فارس کی نسبت لکھی ہے، ہاں ضمیمۂ اتحاد الفریقین میں سید العلماء صاحب نے اس مشورہ کی توجیہ میں پہلے سے زیادہ اپنی لفاظیوں کے جوہر دکھائے ہیں اور ان امور میں جن کا تاریخ میں کہیں نشان تک نہیں ہے وہ وہ قیاس آرائیاں کی ہیں کہ یورپین مورخین جو اس میں بہت بدنام ہیں ان کو بھی سید العلماء نے شرما دیا ہے، لیکن سید العلماء نے اتنا زور لگانے کے بعد بھی جتنا کچھ لکھا ہے اس کا تعلق صرف نتیجہ ۵ سے ہے اور اگر کوشش کی جائے تو شاید ۳ سے بھی کچھ تعلق ہو جائے، باقی تین نتائج کی نسبت سید العلماء صاحب بھی کوئی بات نہیں بنا سکے ہیں اور دل ہی دل میں غالب کا یہ مصرعہ پڑھ کر خاموش رہ گئے ہیں ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

سب سے پہلے سید العلما نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت علیؓ کے مشورہ دینے سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ان کو حضرت عمرؓ سے کوئی عداوت ومخالفت نہیں تھی اور ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ بلند اخلاق انسانوں کا دستور ہے کہ وہ نوعی و اجتماعی معاملات میں اپنے ذاتی کاوشوں کو دخل نہیں دیا کرتے، اجتماعی معاملات میں ذاتی مخالفت اور نفسانیت کا اثر لے کر کوئی بات کہنا یا کرنا دناءت وتنگ ظرفی ہے، اسی وجہ سے باوجودیکہ حضرت علیؓ کو ذاتی طور پر حضرت عمرؓ سے عداوت تھی لیکن جنگ روم وفارس کے موقع پر جو ایک اجتماعی کام تھا اس کا کوئی اثر لیے بغیر اپنی صحیح رائے پیش کردی، سید العلماء کی عبارت کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، لکھتے ہیں: بقیہ صفحہ ۵ پر

ساتویں پیشی

اسلام تہمتوں کے شکنجے میں

تحریر: دکتور شوقی ابوخلیل
ترجمہ: سعاداز ہرالاعظمی

غرانیق

بھلا تم دیکھو تو لات اور عزیٰ کو اور منات تیسرے پچھلے کو،
کیا تم کو تو ملے بیٹے اور اس کو بیٹیاں، یہ بانٹا تو بہت
بھونڈا، یہ سب نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمھارے
باپ دادوں نے، اللہ نے نہیں اتاری ان کی کوئی سند،
محض اٹکل پر چلتے ہیں اور جو جیوں کی امنگ ہے اور پہنچی
ہے ان کو رب سے راہ کی سوجھ [النجم:۱۹-۲۳]

آج وکیل استغاثہ ''قرون وسطیٰ کی تاریخی انسائیکلوپیڈیا'' کی شکل میں کھڑا ہوتا ہے، اس کتاب کو کیمبرج یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، اور دوسرا شخص کارل بروکلمان ہے(۱)۔ انسائیکلوپیڈیا اور بروکلمان دونوں کا الزام ہے کہ: ''پیغمبر اسلام نے اپنی بعثت کے ابتدائی سالوں میں خانۂ کعبہ کے ان تین بتوں کا اعتراف کیا تھا، جن کو ان کے ہم وطن خدا کی بیٹی مانتے تھے۔ اور ان کی طرف آپ نے

---

(۱) تاریخ الشعوب الاسلامیة: ۳۴-۳۵

یہ قصہ شعبۂ تاریخ کے تیسرے سال کی ''انگریزی زبان میں مطالعۂ تاریخ'' نامی کتاب میں اس عنوان کے تحت ذکر ہوا ہے: "The Beginning of Opposition, "Satanic Verses یعنی مخالفت کی ابتدا اور شیطانی آیتیں صفحہ ۱ تا ۲۲۔

مقالہ نگار نے طبری میں وارد ہونے کی وجہ سے بغیر یہ بتائے ہوئے کہ طبری کثرت کے ساتھ روایات کے احاطہ اور جمع میں چاہے وہ جس درجے کی بھی ہوں مشہور ہیں، اس روایت کے ثبوت کا یقین کرلیا ہے، جبکہ یہی مقالہ نگار بعض دوسرے واقعات کے متعلق صحیح روایتوں کو یہ کہہ کر ضعیف قرار دیتا ہے کہ ''یہ روایتی افسانہ ہے''۔ تاریخ کے طالب علم کا پورا سال ان جیسے موضوعات کا مطالعہ کرنے میں صرف ہوتا ہے: غرانیق۔ حبشہ کی ہجرت اقتصادی اور معاشی ہجرت تھی۔ پیغمبر (ﷺ) کی زندگی میں ابوبکر صدیق اور عثمان بن مظعون کے درمیان اختلاف لیڈرشپ کے واسطے تھا۔ اور حدیث افک۔ ان جیسے موضوعات کا انتخاب -جن میں سے ہر ایک کا جواب موجود ہے- کس مقصد کے تحت کیا گیا ہے، اور دوسرے واقعات خاص طور پر عرب اسلامی تہذیب کے حسن و جمال سے صرف نظر کیا گیا ہے۔

ان آیتوں میں اشارہ کیا ہے جو آپ کی طرف وحی ہوئی تھیں کہ: تلك الغرانيق العلى، وإن شفاعتهن ترتضى ۔ پھر نبی کا احساس وحدانیت مضبوط ہو گیا، اور ملائکہ کے علاوہ خدا کے کسی سفارشی کا انھوں نے اعتراف نہیں کیا، اور ترپنویں سورہ نازل ہوئی، جس میں ان تین بتوں کے خدا کی بیٹی ہونے کا انکار ہے''۔

قاضی اسلام کو اپنے دفاع کا حکم دیتا ہے۔

اسلام: غرانیق والی بات کو مستشرقین تنقید و تحلیل کی کسوٹی یا عقل و منطق کی ترازو پر تولے اور پرکھے بغیر اس طرح متفق ہو کر مانتے ہیں گویا وہ کوئی مسلّمہ حقیقت ہو، گویا وہ ایسے مسئلے میں بھی جورد وقدح کے قابل ہو یہ نہیں چاہتے کہ حقیقت منکشف ہو، سوائے ایک اطالوی مؤرخ گیتانی کے جو قصۂ غرانیق کے رد وانکار میں محقق علماء مسلمین کے ساتھ ہے، کیونکہ یہ قصہ سند اور واقعیت کے اعتبار سے بے سروپا ہے۔

غرانیق کی حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ نے جب یہ دیکھ لیا کہ قریش کے لوگ آپ کی بات نہیں مان رہے ہیں، اور آپ کے ساتھیوں کو اذیت دیتے ہیں، تو آپ نے یہ آرزو اور تمنا کی کہ کاش مجھ پر کوئی ایسی چیز نہ نازل ہوتی جو ان کو مجھ سے متنفر کرتی، اور اپنی قوم کے قریب اور نزدیک ہوئے اور قوم بھی آپ کے نزدیک آنے لگی، اسی اثنا میں آپ ایک روز ان مجلسوں میں سے ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے جو کعبہ کے اردگرد قائم ہوتی تھیں، کہ آپ نے ان کے سامنے سورۂ نجم تلاوت کی، جب اس آیت پر پہنچے: ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ والعُزَّى وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى﴾ (بھلا تم دیکھو تو لات اور عزیٰ کو اور منات تیسرے پچھلے کو) تو اس کے بعد آپ نے یہ پڑھا: تلك الغرانيق العلى، وإن شفاعتهن لترتجى ۔ پھر آپ نے آخر تک یہ سورہ پڑھی، اور آپ نے سجدہ کیا، آپ کے ساتھ پوری قوم نے بھی سجدہ کیا، کوئی شخص سجدہ میں پیچھے نہیں رہا، یہاں تک کہ ولید بن مغیرہ اپنے بڑھاپے کی وجہ سے سجدہ نہیں کر سکا، تو اپنی ہتھیلی میں ایک ہاتھ مٹی لے کر اس پر سجدہ کیا۔

پیغمبر (ﷺ) کی اس تلاوت پر قریش نے اپنی رضامندی کا اعلان کیا، اور کہا کہ ہم نے مان لیا کہ اللہ جلاتا ہے اور مارتا ہے، پیدا کرتا ہے اور روزی دیتا ہے، لیکن ہمارے یہ معبود خدا کے یہاں ہماری سفارش کریں گے، اب جبکہ آپ نے ان کا حصہ بھی مقرر کر دیا تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

اس طرح پیغمبر اور قریش کے درمیان جو اختلاف تھا وہ دور ہو گیا۔ یہ بات حبشہ میں موجود مسلمانوں کو معلوم ہوئی، تو انھوں نے کہا کہ ہمارے قبیلے ہم کو زیادہ محبوب ہیں، اور وہاں سے لوٹنے لگے، یہاں تک کہ جب مکہ سے چند گھڑی کے فاصلے پر رہ گئے، تو قبیلہ کنانہ کے چند شتر سواروں سے ان کی ملاقات ہوئی، کنانہ والوں نے ان کے پوچھنے پر ان کو بتلایا کہ (محمد ﷺ نے) ان کے بتوں کا ذکر خیر کیا تو وہ لوگ ان کے تابعدار ہو گئے، پھر اپنی بات سے پھر گئے اور ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنے لگے تو انھوں نے ان کے ساتھ پھر سے برا سلوک کیا۔ کنانہ والوں کی یہ بات سن کر مسلمان آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کیا کرنا چاہئے، تو ان کے اندر اپنے اہل وعیال سے جدائی پر صبر کی طاقت نہ رہی، اور مکہ میں داخل ہو گئے۔

تاریخ وطبقات کی بعض کتابوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ پیغمبر (ﷺ) قریش کے معبودوں کے ذکر خیر سے اس وجہ سے باز آ گئے کہ جب قریش نے یہ کہا کہ جب آپ نے ہمارے معبودوں کا حصہ مقرر کر دیا ہے تو اب ہم آپ کے ساتھ ہیں، تو یہ بات آپ کو بہت گراں گزری، اور جب شام کے وقت آپ نے جبرئیل کو سورۂ نجم سنائی جس میں غرانیق والی بات تھی، تو جبرئیل نے کہا کہ کیا میں آپ کے پاس یہ دونوں باتیں بھی لایا ہوں؟ تو پیغمبر (ﷺ) نے فرمایا کیا میں نے اللہ کی طرف منسوب کر کے وہ بات کہی ہے، جو اللہ نے نہیں فرمائی ہے؟ اس کے بعد اللہ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں: ﴿وَإِنْ كَـادُوا لَيَـفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِىٓ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِىَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ، وَإِذاً لَّا تَّخَذُوكَ خَلِيْلاً، وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْـنَـاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئاً قَلِيْلاً، إِذاً لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَياةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُـمَّ لا تَـجِـدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْراً﴾ [الإسراء: ۷۳-۷۵] (ترجمہ: اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بچلا دیں اس چیز سے کہ جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف تا کہ جھوٹ بنالائے تو ہم پر وحی کے سوا اور تب تو بنا لیتے تجھ کو دوست۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو تو لگ جاتا جھکنے ان کی طرف تھوڑا سا، تب تو ضرور چکھاتے ہم تجھ کو دونا مزہ زندگی میں اور دونا مرنے میں، پھر نہ پاتا تو اپنے واسطے ہم پر مدد کرنے والا)۔

اس کے بعد آپ قریش کے معبودوں کا برے الفاظ میں ذکر کرنے لگے، اور قریش کے لوگ بھی پھر سے آپ کی دشمنی اور آپ کے صحابہ کی ایذا رسانی کرنے لگے اور قریش کے بتوں کی مدح

کرنے والی آیتوں کو منسوخ کر کے آیتوں کی تصحیح کر دی گئی۔ اس قصے کی حکایت کرنے والے اپنی حکایت کی تائید میں درج ذیل آیت پیش کرتے ہیں: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ [الحج: ۵۲] (ترجمہ: اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں، پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا، پھر پکا کر دیتا ہے اپنی باتیں اور اللہ سب خبر رکھتا ہے حکمتوں والا)۔

قرآن وسنت، لغت اور عقلی دلائل سے یہاں تک کہ خود تاریخ کی رو سے یہ واقعہ مردود اور باطل ہے۔

۱:- اس قصے کے مردود اور باطل ہونے کی دلیل اللہ پاک کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ، لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ، ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ﴾ [الحاقة: ۴۴ و ۴۵ و ۴۶] (ترجمہ: اور اگر یہ بنا لاتا ہم پر کوئی بات تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن)، نیز اللہ پاک کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ [النجم: ۳ و ۴] (ترجمہ: اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا)۔

اگر اس طرح کی کوئی بات پیش آتی جو مذکورہ بالا حکایت میں بیان ہوئی ہے، تو اس سے ان آیتوں کی مخالفت لازم آتی۔ اور خود وہ آیت جس سے اس حکایت کا دعویٰ کرنے والوں نے استدلال کیا ہے، قریش کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے کسی طرح کی مداہنت نہ کرنے کا ثبوت پیش کرتی ہے، اس میں ارشاد ہے: ﴿وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا﴾۔ قریش کے لوگ مداہنت اور نرمی ہی چاہتے تھے، مگر اللہ تعالی کے آپ کو ثابت قدم رکھنے کی وجہ سے آپ نے ان کے ساتھ مداہنت کو پسند نہیں کیا۔

اس حکایت کا باطل ہونا اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے: ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ، وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ، وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَهِينٍ﴾ [ن: ۸-۱۱] (ترجمہ: سو تو کہنا مت مان جھٹلانے والوں کا، وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں، اور تو کہا مت مان کسی قسمیں کھانے والے بے قدر کا)۔

حضرت ابن عباسؓ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اگر آپ ان کے ساتھ نرمی کرتے تو وہ نرم ہو جاتے۔

اور حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے اور جس حق پر آپ ہیں اس کو چھوڑ دیتے (۱)۔ مگر آپ جھوٹے کی اس کی کمزوری اور کم وقعتی کی وجہ سے اطاعت نہ کیجئے، وہ مکابرہ اور کمزوری کے سبب محض اپنی جھوٹی قسموں سے بچنا چاہتا ہے۔ یہاں آپ کو مداہنت کرنے والوں کی عدم اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ تو آپؐ جو اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتے تھے آپ کے تئیں مداہنت کرنے والوں کی اطاعت کا یا خدا کی طرف کسی غلط بات کی نسبت کا کیسے تصور ہوتا، اگر آپ کوئی غلط بات منسوب کرتے تو ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ، لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ، ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ﴾ کا معاملہ ہوتا۔

"الإبـريـز" (۲) کے مصنف نے قاضی عیاض اور ابن عربی کے حوالے سے غرانیق والی حکایت کا بھرپور رد کیا ہے۔ اس حکایت کو نقل کرنے والے ضعیف اور اس کی روایتوں میں اضطراب ہے، نیز اس کی سندیں منقطع ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر یہ واقعہ پیش آیا ہوتا، تو بہت سے مسلمان مرتد ہو گئے ہوتے، اور اس طرح کی کوئی بات پیش نہیں آئی۔

اس حکایت کا ذکر کرنے والوں نے جس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے، اس کی تفسیر میں صاحب "الإبـريـز" نے لکھا ہے کہ: اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر پیغمبر اپنی امت کے ایمان کی تمنا اور خواہش کرتا ہے، ان ہی تمنا اور خواہش کرنے والے پیغمبروں میں ہمارے نبی ﷺ بھی تھے، چنانچہ اللہ پاک نے آپ کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً﴾ [الكهف: ٦] (ترجمہ: سوتو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو پچتا پچتا کر)، لیکن لوگوں نے مختلف راستے اختیار کیے، ان میں سے کچھ تو ایمان لائے کچھ کافر ہوئے ﴿فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ﴾ [البقرة: ٢٥٣] (پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا)۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: جلد ۴ صفحہ ۴۰۳

(۲) تالیف: احمد بن المبارک، طبعۃ: مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ص ۲۴۰-۲۴۴

جولوگ کافر ہوئے تو ان کے دلوں میں شیطان نے ایسے وسوسے ڈالے جن سے آپ کی رسالت اور پیغمبری پر ضرب پڑتی تھی جو ان کے کفر کا سبب بنے۔ مومن کو بھی وسوسے پیش آتے رہتے ہیں کیونکہ وہ اکثر و بیشتر ایمان بالغیب کے ساتھ لازم ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالی ان وسوسوں کو نکال پھینکتا ہے جو شیطان پیغمبروں کے ماننے والوں کے دلوں میں ڈالتا ہے، اور اپنی ان نشانیوں کو استحکام بخشتا ہے جو وحدانیت اور رسالت پر دلالت کرنے والی ہوتی ہیں، اور وہ وسوسے منافقوں اور نہ ماننے والوں کے دلوں میں باقی رہ جاتے ہیں (۱)۔

اس کے بعد صاحب "الإبریز" نے لکھا ہے کہ: "حاصل یہ ہے کہ اس آیت کی صحیح تفسیر وہی ہے جو تین باتوں کو ثابت کرتی ہو: وہ عموم جو اس کے شروع میں ہے، وہ تعلیل جو اس کے آخر میں ہے، اور رسالت (پیغمبری) کو اس کا حق عطا کرتی ہے" (۲)۔

ہوسکتا ہے کہ قریش نے خود ہی غرانیق والے واقعے کو گھڑا ہو اور اس کو منافقین نے رائج کیا ہو، اس لیے کہ ان کی تو اسکیم ہی یہ تھی کہ ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِىْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ لِتَفْتَرِىَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ، وَ اِذاً لَا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلاً﴾ (ترجمہ: اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بچلا دیں اس چیز سے کہ جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف تا کہ جھوٹ بنالائے تو ہم پر وحی کے سوا اور تب تو بنا لیتے تجھ کو دوست)۔

قریش ہی نے اس حکایت کو اس لیے گھڑا، تا کہ وہ مہاجرین جنھوں نے ان کے ظلم سے تنگ آ کر حبشہ جا کر پناہ لی تھی وہاں سے واپس آ جائیں، مہاجرین کی واپسی کی جو ان کی خواہش تھی اس کی دلیل یہ ہے کہ نجاشی کے پاس ان کا ایک وفد اس لیے گیا تھا کہ ان مہاجرین کو ان کی قوم میں واپس بھیج دینے کا اس سے مطالبہ کرے، جو حبشہ کی دوسری ہجرت کے بعد پیش آیا تھا۔

۲:- اور از روئے حدیث اس کا غلط ہونا اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے جاہلیت میں بھی بتوں کا احترام نہیں کیا، اس لیے کہ آپ کے بارے میں یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ آپ کبھی کسی بت کے قریب بھی گئے ہوں، آپ نے فرمایا ہے کہ: **بُغِّضَ إليَّ الأوثانُ والشعرُ** (بت اور شاعری سے میرے اندر نفرت پیدا کر دی گئی)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نہ کبھی کسی بت کو سجدہ کیا

(۱) الابریز: ۲۴۳ (۲) الابریز: ۲۴۴

اور نہ اس کے قریب گئے ۔تو جس کو اس کے پروردگار نے ادب دیا ہو اور بہترین ادب دیا ہو اس کے لیے یہ زیادہ سزاوار ہے کہ کسی بت کو نہ مانے ۔ پس جب نبوت کے پہلے آنحضرت ﷺ نے جاہلی اعمال میں سے کسی عمل کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کو محفوظ رکھا، تو اسلام کے بعد وہ کیسے ہوسکتا ہے۔

ابن خزیمہ سے اس قصے کی نسبت سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ یہ بے دینوں کا گھڑا ہوا ہے۔اور بیہقی نے کہا ہے کہ از روئے نقل یہ قصہ ثابت نہیں ہے، اور بخاری کی روایت غرانیق کے ذکر سے خالی ہے۔

ابن کثیر نے جو کہ حدیث میں حجت سمجھے جاتے تھے اور ان کی تفسیر کی کتاب تفسیر بالماثور کی قسم میں مشہور ہے، اپنی تفسیر (۳/ ۲۲۹-۲۳۰) میں لکھا ہے کہ غرانیق والی حدیث مرسل ہے، اور مرسل وہ حدیث ہوتی ہے جس سے صحابی کا واسطہ ساقط ہوتا ہے، اور اصطلاح حدیث میں قاعدہ یہ ہے کہ حدیث کا مرسل ہونا اس کے ضعیف ہونے کا سبب ہوتا ہے(۱)، لہذا یہ روایت یقینی طور پر ضعیف ہے۔

اس روایت کو ضعیف اور اس کو موضوع وجعلی یہ بات بھی ثابت کرتی ہے کہ جن لوگوں نے اس کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، ان کے الفاظ میں بہت اختلاف ہے، بعض لوگوں نے ان الفاظ میں اس کو ذکر کیا ہے: تلك الغرانيق العلى وأن شفاعتهن لترتجى ۔اور کسی میں یہ الفاظ ہیں: تلك الغرانيق العلى وأن شفاعتهن ترتضى۔ اور ایک جگہ یہ الفاظ ہیں: تلك الغرانيق العلى وأن شفاعتهن ترتجى ۔تفسیر ابن کثیر کی پانچویں جلد اور تفسیر بغوی جلد ۵ صفحہ ۶۰۳ میں یہ الفاظ ہیں: وأن شفاعتها لترتجى وأنها لمع الغرانيق العلى۔

امام بیہقی نے از روئے نقل اس قصے کو مجروح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کو روایت کرنے والے مجروح ہیں۔

امام ابن حزم نے فرمایا ہے کہ: ''وہ حدیث جس میں وأنهن الغرانيق العلى وأن شفاعتهن لترتجى آیا ہے، تو وہ صریح جھوٹ ہے، اس لیے کہ وہ از روئے نقل صحیح نہیں ہے، اور اس

(۱) سوائے سعید بن المسیب کے مراسیل کے، ان کے زہد وتقوی اور مرتبہ ومقام کی وجہ سے ان کے مراسیل قابل اعتبار ہوتے ہیں۔

پر توجہ دینا بے مطلب ہے، اس لیے کہ جھوٹ گھڑنے سے کوئی شخص عاجز نہیں ہے'' (۱)۔

۳:-اور از روئے لغت: شیخ محمد عبدہ کے تجزیہ کے مطابق غرانیق کی حکایت کو اس طرح دفع کیا گیا ہے، کہ عربوں نے اپنے بتوں کے لیے کبھی ''غرانیق'' کی صفت نہیں استعمال کی، یہ لفظ نہ ان کی کسی نظم میں استعمال ہوا ہے اور نہ کسی خطبے میں، اور نہ ہی یہ لفظ ان کی زبانوں پر جاری تھا۔ اگر ''غرنوق'' اور ''غرنیق'' کا استعمال ہوا ہے، تو اس کے حقیقی معنی ہی میں ہوا ہے جو کہ ایک سفید یا سیاہ آبی پرندہ ہوتا ہے۔جس کا نام مالک الحزین ہے۔، اور لغت کے اعتبار سے مجازی طور پر گورے خوبصورت نوجوان کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

۴:-اور اس روایت کے مردود و باطل ہونے کی عقلی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ابتدائے عہد اسلام میں خانہ کعبہ کے پاس نماز نہیں پڑھتے تھے مگر اسی وقت جب تنہا ہوتے، اور قریش اپنی شدت عداوت کی وجہ سے آپ کو اس طرح نہیں چھوڑتے تھے کہ آپ قرآن پڑھیں اور وہ سنیں۔ اور یہ بھی روایت کہ صحابہ کرامؓ قریش کی ایذا رسانی کے اندیشے سے یکجا ہونے اور نماز کے لیے مکہ کی گھاٹیوں میں چلے جایا کرتے تھے، قریش کے کچھ احمقوں نے ایک دفعہ ان کو اس طرح دیکھ لیا تو ان کو اور ان کے دین کو برا بھلا کہا تو نوبت مرنے مارنے تک پہنچ گئی۔

۵:-اور تاریخی حیثیت سے: بروکلمان کی ذکر کردہ اس حکایت پر دکتور عمر فروخ کے ذریعے کیے ہوئے رد کو ہم نقل کر رہے ہیں، جس کا مفہوم حسب ذیل ہے:

بعض عیسائی مبلغوں اور مستشرقوں نے اس روایت کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور یہ خیال کیا ہے کہ یہ فعل رسول (ﷺ) نے اس وقت کیا جب مشرکین مکہ نے آپ کی مخالفت کی تو آپ نے یہ چاہا کہ ان سے قریب ہوں، چنانچہ آپ نے ان کے معبودوں کی تعریف کی، مشرکین نے آپ کے اس عمل کو توحید میں آپ کی شدت اور بتوں پر حملے سے پسپائی سمجھا۔ اس افترا کا سب سے بہترین رد ہندوستانی عالم مولانا محمد علی نے کیا ہے (۲)، انھوں نے لکھا ہے:

یہ روایت واقدی اور طبری کی ذکر کی ہوئی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس میں سچائی کا شائبہ

---

(۱) دیکھیے ''الاسلام بین الإنصاف و الجحود'' ص ۶۹ تا ص ۷۲۔

(۲) The Holy Quran, Second Edition. Lahore 1920, p. 1016, note, 2382

تک نہیں ہے، اس لیے کہ آنحضرت ﷺ کا ہر عمل اس رجحان کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ واقدی اسرائیلیات اور بے سروپا روایتوں کے نقل میں مشہور ہے، اسی طرح طبری بھی زیادہ سے زیادہ روایتوں کا احاطہ کرنے اوران کے جمع کرنے میں مشہور ہے، چاہے وہ روایتیں جس درجے کی ہوں۔

حالانکہ اگر ہم محمد بن اسحاق یا صحیح بخاری کی روایت کی طرف رجوع کریں، جو ایسے مصنف ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا کوئی حصہ ذکر کرنے سے چھوڑا نہیں ہے، تو وہاں ہم کو غرانیق والے قصے کا کوئی نام ونشان نہیں نظر آئے گا۔ ابن اسحاق واقدی سے چالیس سال قبل اور طبری سے تقریباً ڈیڑھ سو سال یا اس سے بھی زیادہ پہلے تھے۔ اور بخاری، واقدی کے معاصر تھے، اس کے باوجود انھوں نے اس قصے کو ذکر نہیں کیا، پھر محدثین میں یہ مشہور ہے کہ واقدی حدیثیں وضع کیا کرتا تھا، اور یہ کہ وہ اپنی روایت میں ثقہ نہیں ہے، اسی طرح حدیث کے راویوں میں سے بھی کسی نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔

پھر ان آیتوں کی طرف واپس چلئے اور ان کو تسلسل کے ساتھ پڑھئے، وہ اس طرح ہیں:

﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى، وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى، أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَى، تِلْكَ إِذاً قِسْمَةٌ ضِيزَى، إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم، مَا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ، إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَى﴾ [النجم: ۱۹ - ۲۳] (ترجمہ: بھلا تم دیکھو تو لات اور عزی کو اور منات تیسرے پچھلے کو، کیا تم کو تو ملے بیٹے اور اس کو بیٹیاں، یہ بانٹا تو بہت بھونڈا، یہ سب نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے، اللہ نے نہیں اتاری ان کی کوئی سند، محض اٹکل پر چلتے ہیں اور جو جیوں کی امنگ ہے اور پہنچی ہے ان کو رب سے راہ کی سوجھ)۔

یہ بات عقل سے دور ہے کہ ان متواتر آیتوں کے درمیان کوئی ایسی آیت ڈال دی جائے جو اصل اسلامی عقیدے کے لحاظ سے اور حضرت محمد ﷺ کی حقیقی دعوت کی رو سے ان کے برعکس ہو۔

میں نے ''الکامل فی التاریخ'' کی طرف رجوع کیا تو اس حکایت کو اس میں بھی پایا، مگر میں نے اس کو قطعی طور پر رد کر دیا اس لیے کہ ''الکامل'' کے مصنف ابن الاثیر جزری کی وفات سنہ ۶۳۰ھ میں ہوئی ہے، یعنی ان کا زمانہ طبری کے بہت بعد ہے، جبکہ طبری جو روایات کے احاطہ اور کثرت جمع میں - چاہے وہ جس درجہ کی بھی ہوں - مشہور ہیں، ان کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی ہے۔ لہذا یہ حکایت یقینی طور پر بے دینوں اور زندیقوں کی گھڑی ہوئی ہے، جیسا کہ کامل جلد ۲ صفحہ ۵۲ کے حاشیہ میں مذکور ہے۔

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

علم بلقینی | سراج الدین بلقینی کے لڑکے تھے اور وہ بھی بڑے پایہ کے فقیہ تھے، کئی بار مصر میں قضائے شافعیہ کے عہدہ پر بھی رہے، حافظ ابن حجر وغیرہ کے شاگرد اور سخاوی کے استاذ تھے۔

انھوں نے ۸۱۴ھ میں حج کیا اور ۸۶۸ھ میں وفات پائی۔

جلال بلقینی | سراج الدین بلقینی کے بڑے لڑکے تھے، اور بقول حافظ ابن حجر کے سرعت فہم وجودت حافظہ میں دنیا کے عجائب میں سے تھے، اور بقول ابن ناصرالدین وغیرہ کے اپنے والد کے فضائل وکمالات کے وارث تھے، ان کے بعد فتویٰ کی ریاست ان پر ختم تھی، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ وہ علم کے عاشق تھے، کوئی علمی فائدہ سنتے تو جب تک اس کو خوب سمجھ کر یاد نہ کر لیتے ان کو چین نہیں آتا تھا، انھوں نے شروع میں علوم عربیت کی تحصیل میں محنت نہیں کی تھی، اس لیے جب ۷۸۷ھ میں حج کے لیے گئے تو فہم عربیت کے حصول کی نیت سے انھوں نے آب زمزم پیا، واپسی کے بعد اس میں محنت شروع کی اور تھوڑے دنوں میں ماہر ہو گئے۔

ان کی وفات ۸۲۴ھ میں ہوئی۔

ابن الملقن شافعی | عمر بن علی بن احمد نام تھا، ان کے والد اصلاً اندلسی تھے، پھر تکرور منتقل ہو گئے، کچھ دنوں کے بعد قاہرہ آ گئے، ابن الملقن کی عمر ایک سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ایک بزرگ عیسیٰ مغربی نے ان کے والد کی وصیت کے بموجب ان کی پرورش کی اور ان کی ماں سے نکاح بھی کر لیا، چونکہ وہ جامع طولون میں بچوں کو زبانی قرآن کی سورتیں یاد کرایا کرتے تھے اس لیے لوگ ان کی نسبت سے ان کو ابن الملقن کہنے لگے (کہتے ہیں کہ ان کو کوئی ابن الملقن کہتا تھا تو خفا ہوتے تھے چنانچہ اپنے قلم سے کبھی اپنے کو ابن الملقن نہیں لکھا)

خوش قسمتی سے ان کی ملکیت میں ایک مکان آ گیا تھا، جس کی آمدنی ۴ $\frac{1}{2}$ ماشہ سونا روزانہ تھی، اس سے ان کا سارا کام چل جاتا تھا، باقی نقد وغیرہ جو اپنے والد سے وراثت میں ان کو ملا وہ

کتابوں وغیرہ کے لیے بچ رہا، چنانچہ طاعون عام میں جب ایک محدث کی کتابیں فروخت ہورہی تھیں تو چونکہ ان کے پاس فاضل روپیہ کافی تھا اس لیے دل کھول کر کتابیں خریدیں، اسی موقع پر مسند احمد کا نسخہ صرف تیس درہم میں انھوں نے خریدا تھا۔

ابن الملقن نے فقہ کی تعلیم جمال الدین اسنوی وتقی الدین سبکی وغیرہما سے پائی تھی اور علم حدیث میں انھوں نے متعدد مشائخ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا، مگر اس فن کی تحصیل جم کر انھوں نے مغلطائے حنفی اور زین رجبی سے کی اور انھیں کی تعلیم وتوجہ سے وہ محدث ہوکر نکلے، اس کے بعد بیت المقدس جاکر صلاح علائی کے پاس ان کی تصنیف **جامع التحصیل فی رواۃ المراسیل** پڑھی تو انھوں نے ان کے اجازت نامہ میں **الشیخ الفقیہ الإمام العالم المحدث الحافظ المتقن شرف الفقہاء والمحدثین والفضلاء** کے اوصاف سے نوازا۔

ابن الملقن نہایت کثیر التصنیف عالم تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد تین سو سے زائد ہے، ابن حجر نے کہا ہے کہ نویں صدی کے سرے پر تین شخصیتیں اس عہد کے عجائب میں سے تھیں، عراقی فنون حدیث کی معرفت میں، بلقینی مذہب شافعی کی وسعت معلومات میں اور ابن الملقن کثرت تصنیف میں۔

ابن الملقن نے ۷۶۱ھ میں حج کیا، اور کعبہ مکرمہ کے سامنے ایک محدث کو اجازت نامہ لکھ کر دیا تھا۔ (ضوء)

ابن الملقن کی تصنیفات میں بخاری کی شرح بیس جلدوں میں ہے، جس میں بقول ابن حجر ان کا اعتماد زیادہ تر حافظ قطب الدین حنفی اور حافظ مغلطائے حنفی کی شرحوں پر ہے، گویا وہ مغلطائے کی شرح کی تلخیص ہے، الا یہ کہ انھوں نے کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔

تین جلدوں میں انھوں نے ابن ماجہ کے زوائد (وہ حدیثیں جو صحیحین وترمذی ونسائی وابوداؤد میں نہیں ہیں) بھی لکھے ہیں، اس کا نام انھوں نے **ماتمس إلیہ الحاجۃ** رکھا ہے۔

صوفی وفقیہ ومحدث ابن رسلان شافعی | احمد بن حسین بن حسن نام تھا، ان کے اجداد میں ایک صاحب کا نام ارسلان تھا، اس لیے ابن ارسلان اور اکثر بحذف ہمزہ (الف) ابن رسلان کہے جاتے تھے، ان کے والد تاجر تھے، وہ ان کو دکان پر بھیجتے تو یہ مدرسہ چلے جاتے تھے، ان کے والد ان کو روکتے ہی رہے مگر وہ مانے نہیں مدرسہ جاتے رہے، کچھ دنوں کے بعد اپنے وطن رملہ سے بیت المقدس چلے گئے، اور وہاں کے فقہاء ومحدثین کے پاس فقہ وحدیث میں کمال پیدا کیا، فقہ میں ان کے استاذ قلقشندی وابن الہائم وغیرہ ہیں، شیوخ

حدیث میں الشہاب بن الناصح، ابو ہریرہ ابن الذہبی اور ابوالخیر بن العلائی کے نام سرفہرست ملتے ہیں۔

بہر حال انھوں نے درس کے حلقوں میں حاضری، علماء سے مذاکرہ، اور نہایت محنت کے ساتھ مطالعہ اور طلبہ کو تعلیم دینے کا سلسلہ برابر جاری رکھا، تا آنکہ فقہ واصول وعربیت میں امام وعلامہ اور تفسیر وحدیث وکلام میں خاصے ماہر ہوگئے، اور چونکہ تصوف کا ذوق بھی ان کو تھا اس لیے مشائخ تصوف کی صحبت سے بھی فیضیاب ہوتے رہتے تھے، نفل نمازیں بکثرت پڑھتے تھے، روزے بھی بہت رکھتے تھے، تہجد کے پابند تھے، شیخ محمد قرمی، ابن الناصح اور ابوبکر موصلی وغیرہم نے ان کو خرقۂ تصوف پہنایا تھا، ان کا معمول تھا کہ ہر سال سمندر کے کنارے کسی مناسب مقام پر کچھ دن تنہائی کی زندگی گذارتے تھے، اور خفیہ وعلانیہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے، ظالموں کو ان کی ظالمانہ حرکتوں سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کو گمنامی بہت پسند تھی، اسی لیے کوئی عہدہ قبول نہیں کرتے تھے، بیت المقدس کے ناظر نے وہاں ایک مدرسہ قائم کر کے ان کو اس کا شیخ بنانا چاہا اور کہا کہ گذارے کے لیے روزانہ چاندی کے دس درہم پیش کیے جائیں گے، مگر انھوں نے سختی سے انکار کر دیا، کوئی رئیس طلبہ میں تقسیم کرنے کے لیے کوئی رقم ان کو دیتا تھا تو اس کو بھی نہیں لیتے تھے، سلطان اشرف نے جب آمد کا سفر کیا تو اس کے آنے اور جانے کے وقت وہ رملہ سے بیت المقدس چلے گئے کہ کہیں رملہ میں اس سے یا اس کے امراء میں سے کسی سے ملاقات نہ ہو جائے۔

بہر حال زہد وورع میں اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے، آفاق سے لوگ ان کی زیارت کو آتے تھے، ان کے تلامذہ اور مریدین بکثرت تھے، اور بے شمار اشخاص ان کی صحبت وتربیت سے مہذب وپاکیزہ بن گئے، ان کے صحیح العقیدہ، متبع سنت اور زاہد ومتقی بزرگ ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں تھا۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ علاء بخاری کس دبدبہ کے عالم تھے، اور ان کی علمی عظمت وجلالت کا کیا درجہ تھا، مگر ان کا حال بھی یہ تھا کہ ایک دعوت میں جب ان کا خادم ہاتھ دھلانے کے لیے ان کے سامنے لوٹا اور طشت لایا تو علاء نے اپنے ہاتھوں سے دونوں چیزیں ابن رسلان کے سامنے رکھیں پھر لوٹا ہاتھ میں لے کر خود ان کا ہاتھ دھلایا، انھوں نے بھی انکار یا تامل نہیں کیا، بلکہ دھو کر ان کے لیے دعائے مغفرت شروع کی تو علاء ان کی دعا پر آمین کہتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، جب کھانے سے فارغ ہو کر وہ چلے گئے تو ایک شخص نے علاء سے کہا کہ حضرت ان بلاد (شام) میں ان کا سا کوئی نہیں ہے، تو علاء نے کہا کہ خدا کی قسم مصر میں بھی ان کے جیسا کوئی نہیں ہے۔

ان کے مناقب بسط وتفصیل سے لکھے جائیں تو بہت طول ہوگا، اس لیے اتنے ہی پر اکتفا

مناسب ہے،ان کی وفات ۸۴۴ھ میں ہوئی۔ان کی تصنیفات میں ابوداؤد کی شرح مشہور ہے۔

شمس الدین جزری صاحب حصن حصین محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن علی نام تھا،ان کے والد تاجر تھے، چالیس برس تک ان کے کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا تھا، جب وہ حج کو گئے تو اس نیت سے کہ حق تعالی ان کو ایسا لڑکا عطا فرمائے جو عالم ہو،انھوں نے آب زمزم پیا، خدا نے ان کی تمنا پوری کی اور ۷۵۱ھ میں یہ پیدا ہوئے، ابتدا ہی سے فن قرأت پر ان کی خاص توجہ تھی اس لیے بڑے اہتمام کے ساتھ متعدد ماہر اساتذہ سے اس کو حاصل کیا، تا آنکہ نویں صدی میں ان کو اللہ نے قراء و مجودین کا امام بنا دیا، قرأت کے بعد ان کی توجہ کا مرکز فن حدیث تھا اس کو بھی بہت سے مشائخ سے جن میں ابن کثیر وابن المحب وغیرہ شامل ہیں بہت تندہی سے حاصل کیا اور مہارت پیدا کی، ان دونوں فنون کے علاوہ، فقہ واصول فقہ اور معانی و بیان میں ان کو دخل تھا، تحصیل کے بعد کئی سال جامع بنی امیہ میں درس دیا، پھر مدرسہ عادلیہ اور دار الحدیث اشرفیہ کے شیخ مقرر ہوئے۔

۷۹۸ھ میں کچھ ایسی پریشانیاں پیش آئیں کہ ان کو شام چھوڑنا پڑا، اور وہ بروسہ (ٹرکی) چلے گئے، سلطان بایزید خاں کا زمانہ تھا، اس نامور بادشاہ نے ان کی قدر دانی کی اور بڑے احترام سے ان کو کئی سال اپنا مہمان رکھا، انھوں نے ٹرکی میں علم قرأت وعلم حدیث کی خوب نشر واشاعت کی، جب تیمور لنگ نے ٹرکی پر حملہ کیا تو بایزید خاں کی شہادت کے بعد وہ تیمور کے ساتھ سمرقند چلے گئے، تیمور کے مرنے پر وہ شیراز منتقل ہو گئے اور وہاں بہت سے لوگوں نے ان دونوں فنون میں ان سے استفادہ کیا، ۸۲۲ھ میں وہاں سے حج کے لیے روانہ ہوئے مگر ڈاکوؤں نے مال اسباب لوٹ لیا، اور اس مصیبت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے وقت پر پہنچنا ممکن نہ ہوا، اس سال حج فوت ہو گیا اس لیے کچھ دن ینبع میں پھر مدینہ میں قیام کر کے رجب ۸۲۳ھ میں مکہ پہنچے اور حج کے موسم تک ٹھہر کر حج کیا۔

۸۲۷ھ میں دمشق اور وہاں سے قاہرہ پھر بقصد تجارت یمن گئے اور شاہ یمن کے پاس حدیثیں سنائیں، شاہ یمن نے انعام واکرام سے عزت افزائی کی، یمن سے ۸۲۸ھ میں حج کے لیے مکہ آئے، اس کے بعد شام وبصرہ ہوتے ہوئے شیراز چلے گئے اور وہیں ۸۳۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ان دو حجوں کے علاوہ انھوں نے ۸۰۸ھ میں بھی حج کیا تھا۔

جزری کی تصنیفات میں حصن حصین نہایت بابرکت اور مقبول کتاب ہے، اذکار وادعیہ ماثورہ میں اس سے زیادہ مستند اور مشہور ومتداول دوسری کوئی کتاب نہیں۔

فن قرأت میں بھی ان کی تصنیفات نہایت مفید اور قراء میں متداول ہیں، ان میں **النشر فی القراات العشر** بہت مشہور ہے، قراء کے تذکرہ میں طبقات القراء اور غایات النہایات نہایت نافع وجامع کتابیں ہیں۔

ان کے علاوہ حسب ذیل رسائل کے نام بھی ان کی تصنیفات میں ملتے ہیں۔

(۱) الاجلال والتعظیم فی مقام ابراہیم (۲) الابانۃ فی العمرۃ من الجعرانۃ (۳) التکریم فی العمرۃ من التنعیم (۴) غایۃ المنیٰ فی زیارۃ منیٰ (۶) فضل حراء۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ وہ جب مکہ میں مقیم تھے تو انھوں نے مقدمہ فتح الباری کا ابتدائی حصہ اپنے قلم سے نقل کیا پھر اپنے شاگردوں کی مدد سے اس کو پورا کیا۔ اس کے بعد شیراز سے تقی فاسی کو انھوں نے لکھا کہ تغلیق التعلیق (حافظ ابن حجر کی ایک تصنیف) کا ایک نسخہ کسی طرح حاصل کر کے بھجوایئے، اتفاق سے جب ان کا خط آیا ہے تو میں مکہ میں موجود تھا، تقی فاسی نے اس خط کا مجھ سے تذکرہ کیا تو میرے پاس اس کتاب کا ایک نسخہ موجود تھا میں نے وہی نسخہ ان کو بھیج دیا، نسخہ پہنچ گیا تو انھوں نے مجھ کو خط لکھا جس میں اپنی بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا اسی کے ساتھ اپنی کتاب نشر مجھ کو ہدیہ میں بھیجی، وہ دوجلدوں میں تھی ہر جلد پر اپنے قلم سے اجازت نامہ بھی تحریر فرما دیا تھا، حافظ ابن حجر نے جزری کی تصنیفات میں نشر اور طبقات القراء کی تعریف کی ہے اور حصن حصین کی نسبت لکھا ہے کہ اہل یمن اس کے گرویدہ ہیں۔ (ضوء)

مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس محمد بن یعقوب بن محمد نام تھا، گاذرون میں (جو شیراز کے نواح میں ہے) پیدا ہوئے، سات برس کی عمر میں قرآن پاک یاد کرلیا، خوشنویسی سیکھ لی، اور لغت کی دو کتابیں نقل کر ڈالیں، پھر شیراز میں رہ کر ادب ولغت اور کچھ حدیث کی تعلیم پائی، اس کے بعد واسط جا کر قراآت عشرہ کی تحصیل کی، پھر بغداد گئے، اور چند سال وہاں رہ کر حدیث وغیرہ کی تحصیل میں مصروف رہے۔

۷۵۵ھ میں دمشق گئے اور تقی الدین سبکی وغیرہ سے حدیثیں سنیں، نیز بعلبک وبیت المقدس وغیرہ میں علائی وقلقشندی اور دوسرے محدثین سے جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے، حدیث کا استفادہ کیا۔ دمشق میں دس سال قیام کیا، اور وہاں درس بھی دیا، صلاح الدین صفدی نے اسی زمانہ میں ان سے تعلیم پائی ہے، پھر قاہرہ میں ابن عقیل وغیرہ سے اور مکہ میں یافعی وخلیل مالکی سے استفادہ کیا، انھوں نے شمالی ومشرقی ممالک کی سیاحت کی، شمال میں روم تک اور مشرق میں ہند تک آئے۔

۷۹۶ھ میں زبید (یمن) گئے، الملک الاشرف (شاہ یمن) نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور حد سے زیادہ انکا اکرام کیا، اس نے ہزار دیناران کی ذات پر صرف کئے، اس کے علاوہ حاکم عدن نے ایک ہزار دینار خرچ کر کے زبید میں ان کے قیام کے لیے ساز وسامان مہیا کیا، وہ مطمئن ہو کر الملک الاشرف کی سرپرستی وسایۂ عاطفت میں علم کی اشاعت میں لگ گئے۔

ایک سال چند ماہ کے بعد اشرف نے ان کو پورے یمن کا قاضی مقرر کر دیا، اب ہر طرف سے طلبہ آکر ان سے مستفید ہونے لگے، بادشاہ نے بھی ان کی مجلس میں سماع حدیث کا شرف حاصل کیا، وہ بیس برس سے زائد یمن کے قاضی رہے، انھوں نے اپنی ایک صاحبزادی کا نکاح بھی اشرف سے کر دیا تھا، اشرف نے اپنے انعامات سے ان کو مالا مال کر دیا تھا، ایک دفعہ اپنی ایک تصنیف جو اشرف کے نام سے معنون تھی ایک طبق میں رکھ کر پیش کی تو اشرف نے اس طبق کو روپیوں سے بھر دیا، قیام زبید کے زمانہ میں وہ بہت سی دفعہ مکہ حاضر ہوئے، اور مکہ ومدینہ وطائف میں قیام بھی کیا، وہ اپنے کو مکہ کی طرف منسوب کرنے میں بہت لذت محسوس کرتے تھے، اپنے کو **الملتجی الی حرم اللّٰہ تعالی** (خدا کے حرم کا پناہ گزیں) لکھا کرتے تھے، اس باب میں رضی صغانی حنفی کی نقل اور تقلید کرتے تھے۔

تقی کرمانی لکھتے ہیں کہ وہ صغانی کی کتابوں کے بڑے گرویدہ تھے، اور ان کے نقش قدم پر چل کر ہر بات میں حتی کہ مجاورت مکہ کے باب میں بھی وہ ان کی پیروی کی کوشش کرتے تھے، قیام زبید سے پہلے بھی کم از کم پانچ بار مکہ آئے اور ایک بار دس برس تک مجاور رہے۔

جس ملک میں وہ پہنچے وہاں کے فرماں روا نے ان کی خاطر خواہ پذیرائی کی اور اکرام وتعظیم سے پیش آیا، مثلاً تبریز کے بادشاہ منصور نے، مصر کے حاکم اشرف نے، روم (ٹرکی) کے سلطان بایزید خاں نے، بغداد کے حاکم احمد بن اویس نے، حتیٰ کہ تیمور لنگ نے، کما حقہ ان کی قدر دانی کی۔

تقی کرمانی نے لکھا ہے کہ وہ دہلی میں بہت دنوں رہے ہیں، اور وہاں کے بادشاہ نے بھی ان کا خاطر خواہ اعزاز کیا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے بے شمار نفیس وبیش قیمت کتابیں اکٹھا کر لی تھیں، وہ خود بیان کرتے تھے کہ میں نے پچاس ہزار مثقال سونے کی کتابیں خریدی ہیں، جب وہ سفر میں چلتے تھے تو کتابوں کے کئی گٹھر ساتھ ہوتے تھے، ہر منزل میں ان کا مطالعہ اور اکثر کی دیکھ بھال کرتے رہتے تھے۔

ان کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے، جن میں سب سے زیادہ مشہور ومتداول لغت میں قاموس ہے، جس سے اہل علم اس وقت سے اب تک برابر نفع اٹھا رہے ہیں، اور از انجملہ بخاری کے حصۂ

عبادات کی شرح بیس جلدوں میں ہے، ان کی ایک مطبوعہ مفید کتاب ''سفر السعادۃ'' بھی ہے، جس کی شیخ عبدالحق دہلویؒ نے شرح لکھی ہے، لغت میں ایک دوسری کتاب سو جلدوں میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر صرف پانچ جلدیں پوری ہوسکیں، اس کا نام **اللامع المعلم العجاب** ہے، حرمین شریفین سے متعلق جو کتابیں اور رسالے انھوں نے لکھے ہیں ان کے نام یہ ہیں: **المنی فی فضل منی، المغانم المطابة فی معالم طابه، مهیج الغرام إلی البلد الحرام، اثارة الحجون لزیارة الحجون.**

محدث و مورخ مکہ حافظ تقی الدین فاسی اور حافظ ابن حجر جیسے (اجلۂ علماء) مجد الدین کے شاگرد ہیں، ان دونوں حضرت نے ان کے فضل و کمال اور علم لغت میں ان کی امامت اور فوق العادت تبحر واستحضار کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ فن حدیث میں (ذہبی وعراقی وغیرہ) کی طرح ان کو بہت زیادہ مہارت نہیں تھی، نیز مشائخ اہل علم کے نزدیک ان کی یہ بات ناپسندیدہ اور قابل اعتراض تھی کہ وہ اپنے کو صدیقی اور ابواسحاق شیرازی کی اولاد سے بتاتے تھے، حالانکہ شیخ ابواسحاق شیرازی لاولد فوت ہوئے تھے۔

فاسی نے لکھا ہے کہ وہ پہلی دفعہ ۷۶۰ھ میں مکہ آئے تھے، پھر ۷۷۰ھ میں آئے تو پانچ چھ سال تک برابر وہیں رہے، طائف میں ان کا ایک باغ بھی تھا، انھوں نے مکہ میں ایک مکان تعمیر کرا کے اس کو شاہ یمن کا مدرسہ قرار دیا تھا اور اس میں مدرسین وطلبہ رکھے تھے، یہ مکان صفا پر تھا، اسی طرح کا ایک مکان مدینہ میں بھی تھا، منیٰ وغیرہ میں بھی ان کے مکانات تھے۔

مقریزی نے لکھا ہے کہ صاحب قاموس سے آخری دفعہ میری ملاقات ۷۹۰ھ میں ہوئی صاحب قاموس کو حرمین سے جو محبت تھی اور حج وزیارت سے ان کو جو شغف تھا، اس کا صحیح اندازہ اس ''درخواست'' سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۷۹۹ھ میں ملک اشرف شاہ یمن کے پاس حج کی اجازت طلب کرنے کے لیے بھیجی تھی، وہ ہمارے آپ کے پڑھنے کے قابل ہے، میں اصل درخواست کے بجائے اس کا مختصر ترجمہ پیش کرتا ہوں، صاحب قاموس القاب وآداب کے بعد رقم طراز ہیں کہ:

''بندگان عالی سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ حقیر اب بہت سن رسیدہ ضعیف و کمزور اور لاغر ہو چکا ہے، اس کے جسم میں اب ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں ہے، اس کی مثال اس بوسیدہ عمارت کی سی ہے جو اب گری تب گری، آنحضرت ﷺ کے اس مبارک ارشاد سے سمع ہمایونی بار بار آشنا ہوئے ہوں گے، کہ جب آدمی کی عمر ساٹھ سال ہو جائے تو حق تعالیٰ اس

کومعذور قرار دے دیتا ہے، پھر جو ستر سال سے اوپر اور اسی کے قریب ہو وہ تو بدرجہ اولی اس نوازش کا مستحق ہے۔

علاوہ بریں یہ بڑی نازیبا بات ہے کہ ایک مرد مؤمن کو چار سال ہوجائیں اور رب العالمین کے گھر اور سید المرسلین کے مزار انور کی زیارت کا تازہ شوق وعزم پیدا نہ ہو، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے، اور یہ حقیر چھ سال سے اس رہ گزر کی جادہ پیمائی سے محروم ہے، اضطراب شوق اب حد سے فزوں اور صبر اختیار سے باہر ہے، میری انتہائی آرزو ہے کہ تجدید زیارت اور اس آستانہ پر جبہ سائی کا شرف ایک بار اور نصیب ہو، اس لیے مراحم خسروانہ سے متوقع ہوں کی موسم گرم ہونے سے پہلے تنِ تنہا اس حقیر کو (اہل وعیال کی معیت میں نہیں) سفر کی اجازت کے ساتھ سامان سفر کا اشارہ عالی بھی فرمایا جاوے، اس وقت موسم بھی خوشگوار ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایک ماہ ہر دو مقامات مقدسہ میں قیام کر کے وہاں کے فیوض وبرکات حاصل کئے جائیں۔

زمانۂ قدیم سے خلفائے کرام کا یہ دستور بھی رہا ہے کہ سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اپنا سلام پیش کرنے کے لیے مخصوص طور پر فرستادہ بھیجتے تھے، جو بالقصد صرف اسی کام کے لیے بھیجے جاتے تھے، میری درخواست ہے کہ حضور اس حقیر کو اسی مقصد سے روانگی کا حکم دے دیں، میری کوئی دوسری تمنا نہیں ہے۔

شوقی الی الکعبة الغراء قد زادا
فاستحمل القلص الوخادة الزادا
واستاذن الملک المنعام زید علا
واستودع اللّٰہ اصحابا و اولادا

(اس میں پہلا شعر صغانی حنفی کا ہے اور دوسرا خود صاحب قاموس کا ہے) شاہ یمن کو غالبًا یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اگر وہ حجاز چلے گئے تو پھر واپس نہ آئیں گے شاہ کا یہ خیال صحیح بھی تھا اس لیے کہ وہ مکہ ہی میں وفات پانے کے امیدوار بھی رہا کرتے تھے، اس لیے اس نے خلوص ومحبت وعقیدت میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں یہ جواب دیا کہ میری زبان اور قلم سے یہ لفظ نہیں نکل سکتا کہ آپ یمن سے جاسکتے ہیں اس لیے کہ یمن بالکل تاریک تھا، آپ کے وجود سے وہ

منور ہوگیا، آپ خود جانتے ہیں کہ یہاں علم مردہ ہو چکا تھا، آپ کی بدولت اللہ نے اس کو حیات تازہ بخشی، اس لیے میں تو آپ کو خدا کی قسم دے کر یہی درخواست کروں گا کہ آپ اپنی باقی زندگی بھی ہم کو ہی ہبہ فرما دیجئے، اے مجدالدین میں خدا کی سچی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے دنیا اوراس کی ساری نعمتوں کی جدائی گوارا ہے مگر یمن اور اہل یمن سے آپ کی جدائی گوارا نہیں۔

صاحب قاموس کی وفات زبید میں جب کہ ان کی عمر نوے سال کے قریب تھی ۸۱۷ھ میں ہوئی۔

خواجہ پارسا قدس سرہ نام نامی محمد بن محمد تھا، حافظ الدین کبیر بخاری کی نسل سے تھے اس لیے حافظی بخاری کہے جاتے تھے، ۷۵۶ھ میں ولادت ہوئی، معقول و منقول میں یگانۂ روزگار تھے، فقہ و حدیث کی تحصیل امام ابوطاہر محمد بن محمد طاہری کی خدمت میں کی، خواجہ صاحب صحیح بخاری کی روایت انھیں ابوطاہر طاہری اور ان کے والد ابوالمعالی سے کرتے تھے۔ (ضوء)

آپ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کے عزیز ترین خلیفہ تھے، خواجہ صاحب نے فرمایا تھا کہ جو امانت ہم کو اس خاندان خواجگان سے پہنچی ہے اور ہم نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب تم کو سپرد کرتے ہیں۔

خواجہ پارسا کی عظمت و بزرگی کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک بار حضرت خواجہ بزرگ کے یہاں کوئی مکان تعمیر ہو رہا تھا، اور خواجہ صاحب کے تمام اصحاب و مریدین جو موجود تھے، گارے مٹی کے کام میں لگے ہوئے تھے، خواجہ پارسا جہاں گارا بنتا تھا وہاں گارا بناتے یا اٹھاتے تھے، جب دوپہر ہوئی تو خواجہ بزرگ نے سب سے کہا کہ اب آرام کرو، سب لوگ ہاتھ پیر دھو کر سایہ میں جا کر سو رہے مگر خواجۂ پارسا جہاں تھے وہیں دھوپ میں گارے پر پیر پھیلا کر سو رہے، اس کے بعد خواجۂ بزرگ برآمد ہوئے اور تمام لوگوں کی طرف سے گزرتے ہوئے جب خواجہ پارسا کے پاس پہنچے اور ان کو اس کیفیت سے سوتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اپنا روئے مبارک ان کے پیروں پر ملا اور کہا کہ اے اللہ! ان پیروں کے صدقہ میں بہاء الدین پر رحمت کر۔ (رشحات)

اسی کتاب میں اسی طرح کا دوسرا واقعہ یوں مذکور ہے کہ ایک دن خواجۂ پارسا ایک حوض میں پاؤں لٹکا کر مراقبہ میں مشغول تھے، کہ حضرت خواجۂ بزرگ تشریف لائے اور فوراً تہمد باندھ کر حوض میں اترے اور خواجۂ پارسا کے تلوں پر اپنا منھ رکھ کر کہا کہ اے خدا! ان پاؤں کی برکت سے بہاء الدین پر رحمت کر۔ (رشحات)

خواجہ پارسا کا ذکر کفوی نے فقہائے حنفیہ میں، اور سخاوی نے الضوء اللامع میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ امین اقصرائی نے ان سے صحیح مسلم کا کچھ حصہ پڑھا تھا، اور صحیح بخاری کی اجازت ان سے حاصل کی تھی، اور امین اقصرائی ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔

باطنی مقامات عالیہ کے ساتھ علم کتاب وسنت اور معقول میں بھی خواجۂ پارسا کا پایہ بہت بلند تھا، جیسا کہ خواجہ صاحب کی تصنیفات، فصول ستہ، فصل الخطاب اور مخزن العارفین وغیرہ اس دعوی کا بین ثبوت ہیں۔

عارف جامی اور واعظ کاشفی نے لکھا ہے کہ آپ نے دو حج کیے ہیں، پہلی دفعہ حضرت خواجہ بزرگ شیخ بہاء الدین نقشبند کی معیت میں گئے تھے، دوسری دفعہ ۸۲۲ھ میں بخارا سے نکلے اور نسف کے راستہ سے صغانیان، ترمذ، بلخ اور ہرات میں بزرگوں کے مزارات کی زیارت کرتے ہوئے گئے، جس جس شہر سے آپ کا گزر ہوا وہاں کے سادات، مشائخ اور علماء نے آپ کی تشریف آوری کو غنیمت سمجھ کر نہایت اعزاز وتکریم سے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

عارف جامی فرماتے ہیں کہ اس سفر میں ولایت جام (جامی کے وطن) سے بھی آپ کا گزر ہوا، اس وقت میری عمر کے پانچ سال پورے نہ ہوئے تھے، والد نے کسی سے کہا کہ اس کو کندھے پر خواجۂ پارسا کی سواری کے سامنے لے جاؤ، خواجہ نے نگاہ ڈالی اور ایک سیر کرمانی مصری عنایت فرمائی اس کو آج باسٹھ سال ہو گئے، آج تک وہ نورانی چہرہ آنکھوں میں اور دیدار مبارک کی لذت دل میں موجود ہے۔

۱۱/ جمادی الاولی کو نیشاپور سے حجاز کا رخ کیا اور خیر وعافیت سے مکہ معظمہ پہنچ کر تمام ارکان حج خیر وخوبی سے بجا لائے۔ اس کے بعد مزاج مبارک ناساز ہو گیا تا آنکہ طواف وداع عماری میں بیٹھ کر کرنا پڑا طواف کر کے مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور چہار شنبہ ۲۳/ ذی الحجہ ۸۳۲ھ کو مدینہ پہنچ کر روضۂ مبارک کی زیارت کی اور پنجشنبہ ۲۴/ ذی الحجہ کو آپ کا وصال ہو گیا۔

اسی سفر میں ۱۲/ ذی الحجہ کو مقام منیٰ میں آپ نے امین اقصرائی کو صحیح بخاری کی اجازت عطا فرمائی تھی، اسی سال علامہ شمس الدین فناری (ترکی عالم) نے بھی حج کیا تھا، اور خواجہ کی وفات کے وقت مدینہ منورہ میں موجود تھے، انھیں نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، جنازہ میں اہل قافلہ کے سوا اہل مدینہ بھی شریک تھے۔

(ضوء، نفحات، رشحات، فوائد بہیہ)

اس سفر میں آپ کے صاحبزادہ خواجہ ابونصر پارسا بھی ہمرکاب تھے، آپ کی وفات ۸۶۵ھ میں ہوئی۔

امام ربانی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

سلسلۂ بیعت، زہد واخلاق

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب کھیری باغ روڈ مئو

رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کارنبوت کے جو تین فرض عطا ہوئے ہیں: تلاوت احکام، تعلیم کتاب وحکمت، اور تزکیہ، یہ تینوں فرض امت مسلمہ پر بھی بطور کفایہ عائد ہیں۔ چنانچہ قرناً بعد قرنٍ اکابر ائمہ امت نے ان تینوں فریضوں کی ادائیگی میں پوری توجہ اور کوشش مبذول فرمائی ہے اور انھیں کے مجاہدات کا نور ہے جس سے کاشانہ اسلام میں روشنی ہے، نبوت کے یہ تینوں فرض اس آیت میں یکجا ہیں:

رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

ایک رسول انھیں میں سے جو اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک وصاف کرتا اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ان تینوں فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیا، لوگوں کو احکام الٰہی اور آیات ربانی پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب الٰہی اور حکمت ربانی کی باتیں سکھائیں اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنی صحبت، فیض تاثیر اور طریق تدبیر سے پاک وصاف بھی کیا۔ نفوس کا تزکیہ فرمایا۔ قلوب کے امراض کا علاج کیا اور برائیوں اور بدیوں کے زنگ اور میل کو دور کرکے اخلاق انسانی کو نکھارا اور سنوارا۔ یہ دونوں ظاہری وباطنی فرض یکساں اہمیت سے ادا ہوتے رہے، چنانچہ صحابہؓ اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کے تین قرنوں تک یہ دونوں ظاہری وباطنی کام اسی طرح توام رہے، جو استاد تھے وہ شیخ تھے، اور جو شیخ تھے وہ استاذ تھے، وہ جو مسند درس کو جلوہ دیتے تھے وہ خلوت کے شب زندہ دار اور اپنے ہم نشینوں کے تزکیہ وتصفیہ کے بھی ذمہ دار تھے، ان تینوں طبقوں میں استاد اور شیخ کی

تفریق نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد وہ دور آنا شروع ہوا جس میں مسند ظاہر کے درس گو، باطن کے کورے اور باطن کے روشن دل، ظاہر سے عاری ہونے لگے اور عہد بعہد ظاہر و باطن کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی، تا آنکہ علوم ظاہر کے لیے مدارس کی چہار دیواری اور تعلیم وتزکیہ باطن کے لیے خانقاہوں اور رباطوں کی تعمیر عمل میں آئی اور وہ مسجد نبوی جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے، اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علماء دین کی جگہ علماء دنیا نکلنے لگے اور باطن کے مدعی علم شریعت کے اسرار و کمالات سے جاہل ہو کر رہ گئے۔

تاہم اس دور کے بعد بھی ایسی مستثنیٰ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں، جن میں نور نبوت کے یہ دونوں رنگ بھرے تھے اور غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں جن بزرگوں سے فیوض پہنچے اور پھیلے وہ وہی تھے جو ان دونوں کے جامع تھے۔ امام غزالیؒ جن سے علم معقول ومنقول نے جلوہ پایا، علم حقیقت نے بھی انھیں کے ذریعہ ظہور پایا۔ حضرت شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ ایک طرف شیخ طریقت ہیں تو دوسری طرف مدرسہ نظامیہ کے مدرس۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ امام وقت اور شیخ طریقت دونوں ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کو علماء ظاہر سمجھا جاتا ہے جیسے حضرات محدثین امام بخاریؒ، ابن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ وغیرہ وہ بھی اس جامعیت سے سرفراز تھے۔ متوسطین میں علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیم رحمہما اللہ کو ناواقف باطن سے خالی سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے احوال وسوانح ان کی برکات باطنی سے لبریز ہیں۔ ابن قیمؒ کی ''منازل السالکین'' وغیرہ کتابیں پڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ وہ آرائش ظاہر اور جمال باطن دونوں سے آراستہ تھے۔

ہندوستان میں جن بزرگوں کے دم قدم سے اسلام کی روشنی پھیلی وہ حقیقت میں وہی تھے جن کی ذات میں مدرسہ اور خانقاہ کے کمالات کی جامعیت تھی کہ وہ اسوۂ نبوت سے قریب تر تھے۔ اس لئے ان کا فیض بعید سے بعید تر حصہ تک پھیلتا چلا گیا۔ آسمان دلی کے مہر و ماہ اور تارے شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر شاہ اسماعیلؒ تک کو آپ ایک ایک کر کے دیکھیں تو ظاہر و باطن کے علوم والوں کی یکجائی کا نظارہ آپ کو ہوگا اور اس سے ان کے علمی وروحانی برکات کی وسعت کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔ وہ علوم کی تدریس کے وقت **یعلمهم الکتاب والحکمة** کا جلوہ دکھاتے تھے

اور حجروں میں بیٹھ کر ''یز کیھم''کی جلوہ ریزی فرماتے تھے۔

پھران کے بعدان کے فیوض وبرکات کے جو حامل ہوئے جن کی نشاں دہی چنداں ضروری نہیں کہ ''**سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود.**'' ان سے دنیا کو جو فیوض پہنچا اوردین کی اشاعت وتبلیغ اورقلوب ونفوس کے تزکیہ وتصفیہ کا جو کام انجام پایا وہ بھی ظاہر وباطن کی اسی جامعیت کے آئینہ دار تھے اورآئندہ بھی سنن الٰہیہ کے مطابق دین کا فیض جن سے پھیلے گا وہ وہی ہوں گے جن کے اندر مدرسیت اورخانقاہیت کی دوسوتیں ایک چشمہ بن کر بہیں گی ''**مرج البحرین یلتقیان**'' آنکھوں کا نور شب بیداری سے بڑھتا اور زبان کی تاثیر ذکر کی کثرت سے پھیلتی ہے۔ رات کے راہب ہی اسلام میں دن کے سپاہی ثابت ہوئے ہیں۔سوانح وتراجم کا سیزدہ صد سالہ دفتر اس دعویٰ کا شاہد ہے۔زبان کی روانی اورقلم کی جولانی دل کی تابانی کے بغیر سراب کی نمو سے زیادہ نہیں خواہ وہ اس وقت کتنا ہی تابناک نظر آتا ہو مگر وہ مستقل اور مستقبل وجود سے محروم ہے۔

''پیام برقوم'' از علامہ سید سلیمان ندویؒ (حضرت مولانا الیاسؒ اوران کی دینی دعوت ص۱۰،۱۱،۱۲،۱۳)

''دل کی تابانی'' کے حصول کے لیے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جو بیک وقت محدث، مفسر،فقیہ اورصوفی ہیں تحریر فرماتے ہیں:

بداں اسعدک اللہ تعالیٰ ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان واسلام وشریعت است ومغز وحقیقت اودرخدمت درویشاں باید جست (مالا بدمنہ۔کتاب الاحسان)

جانو! اللہ تعالیٰ تم کو نیک بخت بنائے کہ یہ بیاں جو گذرا یہ تو ایمان واسلام اورشریعت کی ظاہری صورت تھی، باقی اس کا مغز درویشوں کی خدمت میں تلاش کرنا چاہئے۔

پھرذرا آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ واسلم را از سینۂ درویشاں باید جست وبداں نور سینۂ خود راروشن باید کرد (ایضاً)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو بزرگوں کے سینے سے حاصل کرنا چاہئے اوراس نور سے اپنے سینے کوروشن اورمنور کرنا چاہئے۔

امام ربانی حضرت محدث الاعظمیؒ کی حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت:

''تذکرہ مصلح الامتؒ'' (مرتب حضرت مولانا قمرالزماں صاحب دامت برکاتہم خلیفہ اعظم حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ) کے مقدمہ میں امام ربانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

وہ میری زندگی کے نہایت مسعود ومبارک لمحات ہیں جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذرے، مجھے حاضری کی سعادت پہلی بار اس وقت حاصل ہوئی جب دارالعلوم دیوبند میں طالب علمانہ زندگی بسر کررہا تھا۔ ۱۳۴۷ھ میں غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانویؒ قدس سرہ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی، مگر خوش قسمتی سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہوگیا۔ پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت حضرت مولانا فتح پوری صاحبِ سوانح اور خواجہ صاحب (مجذوب تخلص) خانقاہ میں موجود تھے، مولانا فتح پوری حضرت اقدس کی نشست گاہ کے پیچھے ایک تنگ حجرہ میں سامنے ذرا داہنے کو ہٹ کر بیٹھنے پر مامور تھے اور وہیں حضرت کے ملفوظات قلمبند کرتے تھے، مولانا فتح پوری کو کئی دن تک دیکھنے اور وقتاً فوقتاً اپنی اپنی قیام گاہ پر آنے جانے، ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا۔ عصر کے بعد خانقاہ کے دروازہ پر ایک چائے خانہ میں چائے پینے اور گفتگو کی بھی نوبت آئی۔ جس شب میں بعد نماز مغرب میں شرف بیعت سے مشرف ہوا تھا اس کے بعد والے دن میں غالباً بعد عصر حضرت مولانا فتح پوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی وصول کرنی چاہئے، ان کو حضرت نے زمانہ طالب علمی میں بیعت کرلیا، حالانکہ حضرت ایسا نہیں کیا کرتے یہ ان کی خصوصیت ہے۔ (تذکرہ مصلح الامت ص: د-ہ)

یہ خصوصیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی تھی۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بالعموم بچوں اور طالب علموں کو بیعت نہیں کرتے تھے، فراغت اور تکمیل کے بعد اس کی اجازت ہوتی تھی، مگر مولانا الیاس صاحبؒ کے غیر معمولی حالات کی بناء پر ان کی خواہش و درخواست پر بیعت کرلیا تھا۔ (حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ص ۵۴)

ایک غلطی کا ازالہ:

ابھی حال ہی میں ایک کتاب ''بزرگوں کے خطوط بنام مولانا سید سلمان حسینی ندوی'' نظر

سے گزری ہے، مرتب محمد عبدالرشید ندوی ہیں۔ ''بزرگوں پر توضیحی حواشی''، محمودالحسن ندوی نے لکھے ہیں ان حواشی پر مولانا سید سلمان حسینی کی ''سند'' ملاحظہ ہو:

بزرگوں پر توضیحی حواشی کا کام عزیزم محمود حسن حسنی سلمہ کے سپرد کیا گیا تھا جس کو انھوں نے بخوبی انجام دیا (ایضاً ص ۶)۔ حضرت محدث اعظمیؒ کے ''توضیحی حواشی'' کے تحت رقم طراز ہیں:

''بیعت وسلوک کا باقاعدہ تعلق عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ سے قائم کیا اور ان کے خلیفہ ہوئے''۔ (بزرگوں کے خطوط ص ۲۴)

تحقیق کے لیے آبلہ پائی اور کوہ کنی کی ضرورت ہے، اس راہ پُر خار میں سرسری مطالعے اور ظنیات کی کوئی حیثیت نہیں ہے، حیرت ہے کہ مولانا سید سلمان حسینی جیسے بلند پایہ عالم نے کس طرح ''عزیزم محمود حسن حسنی'' پر اعتماد کیا اور ایک غلط اور غیر محققانہ بات لکھنے کے باوجود ''بخوبی انجام'' دینے کی سند بھی عنایت فرما دی۔

امام ربانی حضرت محدث الاعظمیؒ کے تعلق سے محمود حسنی صاحب کا یہ حاشیہ اس لیے زیادہ افسوسناک ہے، کہ یہ تحریر ''حیات ابوالمآثر'' کی طباعت کے بارہ سال بعد لکھی گئی ہے اور ضلع مئو کے قریب لکھنؤ میں مقیم شخص نے سپرد قلم کیا ہے پھر بھی محشی نے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی۔

امام ربانی مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی بیعت کے تعلق سے ایک دوسری تحریر بھی پڑھ لیں:

حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (کراچی) تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کا صوفیانہ مسلک حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک ہے، آپ حضرت تھانویؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور انہی کے مسلک ومشرب پر قائم رہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی بہت عزت کرتے تھے جیسا کہ ''التنقید السدید'' کی تقریظ سے اور اس تحریر سے جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے آپ کی معرکۃ الآرا کتاب ''نصرۃ الحدیث'' پڑھ کر آپ کو بھیجی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز متوسلین میں شمار کیے جاتے ہیں اور انہی کے اصول کے مطابق زندگی گذاری ہے۔ (کاروان تھانویؒ ص ۲۳۰ مطبوعہ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ = دسمبر ۱۹۹۷ء)

مندرجہ بالا تحریر ''حیات ابوالمآثر'' کی طباعت کے تین سال قبل لکھی گئی ہے اور محقق

ہندوستان (لکھنؤ) کے بجائے پاکستان (کراچی) سے تعلق رکھتے ہیں لیکن کس قدر تلاش، جستجو اور تحقیق کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

حضرت محدث اعظمیؒ، حضرت مولانا محمد احمد پرتا بگڈھیؒ سے نہ بیعت تھے اور نہ ان کے خلیفہ تھے۔ دونوں بزرگوں کا تعلق ایک دوسرے سے نیاز مندانہ تھا۔ راقم سطور جس وقت تعلیم کے سلسلہ میں الہ آباد میں مقیم تھا، اسی زمانہ میں ایک دن اپنے شیخ واستاد حضرت مولانا حافظ شاہ محمد قمر صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم کے ہمراہ حضرت پرتا بگڈھیؒ کی خدمت میں جو اس وقت سیوئیں منڈی میں مقیم تھے، بعد نماز عصر حاضری ہوئی۔ سبھی لوگ نیچے بیٹھے ہوئے تھے، حضرت محدث اعظمیؒ ایک تخت پر استراحت فرما رہے تھے اور مولوی لئیق صاحب مرحوم حضرت اعظمیؒ کا پیر دبا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد راقم نے دیکھا کہ حضرت پرتا بگڈھیؒ اپنی نشست گاہ سے اٹھ کر حضرت اعظمیؒ کے تخت کے پاس آئے اور آپ کا پیر دبانے لگے، تھوڑی دیر کے بعد مولوی لئیق مرحوم سے یہ فرما کر چلے گئے کہ ''مولوی لئیق ذرا اچھی طرح دباؤ''۔

اجازت وخلافت:

حضرت مولانا قمر الزماں صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

حضرت مولانا اعظمی کی آمد ورفت برابر حضرت مصلح الامت کی خدمت میں رہی اور جانبین سے بہت ہی خاص تعلق تھا، حضرتؒ آپ کی ضیافت کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ حضرت مصلح الامتؒ کو آپ سے غایت تعلق ومحبت تھی چنانچہ ایک مکتوب کے ضمن میں یہ تحریر فرمایا ہے:

گر بسر وچشم من نشینی نازت بکشم کہ نازنینی

آپ کی رضا، مرضی، خوشنودی ملحوظ رکھوں گا، آپ کو راضی کر کے عندیہ معلوم کر کے کام کروں گا۔ زیادہ کیا عرض کروں میرے لیے دعا فرمائیے کہ آپ لوگوں سے محبت کروں۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ (تذکرہ مصلح الامت حصہ دوم ۱۹۵،۱۹۴)

ایک دوسرا والا نامہ جسے حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے عزیز خاص سے لکھوا کر ارسال فرمایا ہے جس سے آپ کے غایت درجہ وثوق واعتماد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

مخدومنا المکرّم حضرت مولانا صاحب مد فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمدللہ حضرت والا دامت برکاتہم بخیر وعافیت ہیں اور فرمارہے ہیں کہ خادم آپ کی خدمت میں لکھے کہ اسی سفر کے دوران قیام میں بعد مغرب بیت الخلا جانے کا ارادہ کررہا تھا کہ علماء حضرات میرے پاس آگئے تو آپ نے فرمایا کہ آپ بیت الخلاء تشریف لے جائیں جب تک میں آپ کی نیابت کروں گا، میں تو آپ سے کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔مگر چونکہ آپ نے خود ہی فرمایا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ آپ میری غیر موجودگی میں میری نیابت کریں اور میرا یہ خط میرے چند مخلص حضرات کو بھی دکھلا دیں۔مثلاً قاری صاحب، مفتی صاحب، حافظ یعقوب صاحب، بابا محمد خلیل صاحب، سیٹھ صاحب وغیرہ کو۔والسلام

(دستخط عزیز خاص) (تذکرہ مصلح الامت جلد اص: ی)

دیکھئے کس لطیف انداز میں حضرت مصلح الامتؒ نے حضرت محدث الاعظمیؒ کو اجازت وخلافت سے نوازا:

''میں تو آپ سے کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔مگر چونکہ آپ نے خود ہی فرمایا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ آپ میری غیر موجودگی میں میری نیابت کریں''۔

یہ جملہ کس قدر تواضع اور فنائیت سے لبریز ہے اور اس سے حضرت شاہ صاحبؒ کے دل میں حضرت محدث الاعظمیؒ کی عظمت اور قدر ومنزلت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اب آخری ملاقات کی کیفیت خود حضرت محدث کبیرؒ سے سنئے، تحریر فرماتے ہیں:

''۱۳۸۷ھ میں حرمین کا شوق غالب آیا اور ۱۱ر شعبان ۱۳۸۷ھ کو مظفری جہاز سے حجاز کے لیے روانہ ہوئے، یہ ناچیز ان کی مشایعت اور رخصت کرنے کی غرض سے جہاز میں ان سے ملاقات کرنے گیا اور دو گھنٹہ وہاں رہا، رخصت کے وقت دیر تک معانقہ کیا، حضرت شیخ نے اپنی حد درجہ محبت وشفقت کی وجہ سے ناچیز کے سر اور ہاتھ کا بوسہ دیا اور عطر عود کی ایک شیشی ہدیہ کی، ناچیز اسی دن بمبئی سے روانہ ہوا اور جمعہ کے دن مئو وارد ہوا، سنیچر کے دن مغرب کے بعد آٹھ بجے یہ خبر پہنچی کہ مولانا نے جہاز میں جان جان آفریں کے سپرد کردی، یہ خبر بمبئی سے بذریعہ ٹیلیگرام ہوئی تھی، مت پوچھو کہ اس خبر

سے مجھ پر کیا گذری‘‘(حیات ابوالمآثر جلد اص ۶۸۹)

زہدواستغناء:

یہ علماء ربانی اور مشائخ حقانی کی سب سے نمایاں صفت ہے جو انھیں علماء سوء سے ممتاز کرتی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی وہ تحریر بھی نقل کردی جائے جو امام موصوف نے علماء سوء کی تعریف میں تحریر فرمائی ہے:

وقد ورد فی العلماء السوء تشديدات عظيمة دلت على أنهم أشد الخلق عذابا يوم القيامة فمن المهمات العظيمة معرفة العلامات الفارقة بين علماء الدنيا وعلماء الآخرة ونعنى بعلماء الدنيا علماء السوء الذين قصدهم من العلم التنعم بالدنيا والتوصل الى الجاه والمنزلة عند أهلها (تالیفات مصلح الامت ج اص ۱۷۷)

ترجمہ: اورقرآن وحدیث میں علماء سوء کے بارے میں ایسی ایسی سخت وعیدیں آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز سب لوگوں سے زیادہ انہی کو عذاب ہوگا، لہذا ان علامات کا جاننا اشد ضروری ہوا جو علماء دنیا کو علماء آخرت سے جدا کرتی ہیں، اور ہماری مراد علماء دنیا سے وہ علماء سوء ہیں جن کا مقصد اپنے علم (دین) سے محض دنیاوی راحت وآرام ہے اور اسے جاہ طلبی کا ذریعہ بنانا ہے یا اس کے ذریعہ سے اہل جاہ کی نظروں میں وقیع بننا ہے۔

حضرت امام ربانیؒ کی پوری زندگی عالم ربانی اور شیخ حقانی کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے، حب مال اور حب جاہ سے کوسوں دور تھے، نام ونمود اور شہرت سے بے نیاز تھے، محض **إن اجری الا علی اللہ** پہ نظر تھی۔ ان کی زندگی میں عرب وعجم کی طرف سے کئی ایک مناصب جلیلہ اور بڑی اونچی تنخواہیں پیش کی گئیں لیکن اس مرد درویش نے ہمیشہ باوجود تنگی وعسرت کے ’’ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم‘‘ کو اپنا شعار بنائے رکھا، اور بوریہ نشینی کو عیش وعشرت کی زندگی پر ترجیح دی ؎

گو ہوا ہے تند وتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

یہاں حضرت امام ربانیؒ کی حیات مبارکہ سے زہد واستغناء کے چند واقعات ہدیہ ناظرین ہیں:

ا:-حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ رقم طراز ہیں:

امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ندوۃ المصنفین کی طرف سے 'ترجمان السنۃ' کی تصنیف وتالیف کا کام کر رہے تھے، لیکن اس کام کی رفتار اتنی سست تھی کہ ارباب ندوۃ المصنفین کو اس کی تکمیل کے سلسلے میں برابر فکر لاحق تھی، اس صورت حال کے پیش نظر ندوۃ المصنفین کے اس وقت کے ناظم حضرت مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے حضرت والد صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں، اور اس کے لیے انھوں نے اس زمانہ کے لحاظ سے ایک معقول حق الخدمت کی پیش کش کی، لیکن والد صاحب اپنے مشاغل اور خاص مزاج کی وجہ سے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اسی اثنا میں والد مرحوم کے رفیق اور دوست حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمیؒ کسی کام کے لیے دہلی گئے۔ وہاں مولانا عثمانی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تو مولانا عثمانی کہنے لگے کہ مولانا -یعنی والد مرحوم- کے پاس کھیت اور زمین جائداد وغیرہ بہت زیادہ ہے کیا؟ مولانا ایوب صاحبؒ نے فرمایا کہ رہائشی مکان کے علاوہ مولانا کے پاس کھیت اور جائداد کے نام پر ایک انچ زمین بھی نہیں ہے، یہ جواب سن کر مولانا عثمانی ورطہ حیرت میں پڑ گئے کہ اس کے باوجود اتنی بڑی پیشکش کو رد کر دیا! مولانا ایوب صاحبؒ نے فرمایا کہ مولانا کا بس یہی خاص مزاج ہے۔ (حیات ابوالمآثر جلد ثانی ص ۲۴)

۲:-حضرت مولانا سید محمد یحیی صاحب ندوی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا (سعید احمد) اکبرآبادی حضرت کے بے حد قدرداں تھے، اور حضرت اعظمی بھی ان سے بہت بے تکلف تھے، مولانا اکبرآبادی نے آپ سے عرض کیا کہ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس کے عہدے سے سبکدوش ہو رہے ہیں، آپ اس منصب کو قبول فرمالیں، یہاں آپ کے ذوق کے مطابق ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ ہے، جس میں بہت سے مخطوطات ونوادرات کا ذخیرہ ہے، حضرت اعظمیؒ نے فرمایا کہ مولوی سعید! میں ملازمت نہ کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔

مدرسہ عالیہ کی صدر مدرسی کوئی معمولی عہدہ نہیں تھا، منصب و جاہ دنیا سے حضرت مولانا اعظمیؒ کی بے رغبتی و بے نیازی کا یہ پہلا نقش تھا جو میرے لوح قلب پر مرتسم ہو گیا (ایضاً ص ۳۰،۲۹)

۳:- علامہ ابراہیم بلیاویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے دیوبند تشریف لے جارہے تھے، راستے میں لکھنؤ میں قیام فرمایا، میں اس وقت ندوہ میں بحیثیت مہمان مقیم تھا، حضرت اعظمیؒ کا قیام اپنے عزیز شاگرد مولانا منظور نعمانی کے یہاں تھا............کچھ دنوں کے بعد حضرت پٹنہ تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ کے بعد صدر مدرسی کا عہدہ کن کے سپرد ہوا، فرمانے لگے کہ مولانا عبدالصمد اور مولانا منت اللہ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ صدر مدرسی کا عہدہ قبول فرمالیں، آپ کے علاوہ کوئی اور اس کا حقدار نہیں ہے، میں نے کہا کہ آپ لوگ یہ عہدہ میرے سپرد کر رہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری اہلیت اور صلاحیت کے معترف ہیں، تو آپ لوگوں کے اس اعتماد کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ اس کے مجھ سے زیادہ حقدار مولانا فخر الدین ہیں، اس لیے ان ہی کے سپرد کر دیا جائے، اور پھر اسی پر مجلس شوریٰ نے فیصلہ کر دیا، اس طرح ایک بار پھر حضرت اعظمیؒ نے دارالعلوم کے اہم منصب کو خوش اسلوبی سے ٹال دیا۔(ایضاً ص ۳۵)

۴:- ایک دفعہ مشکلات نے اس طرح چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا کہ صرف آپ کے مقربین ومخصوصین ہی کو اس کا علم تھا، اس وقت مفتی ظفیر الدین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ مولوی یحییٰ یہ میرے استاذ ہی کا دل وجگر ہے کہ صبر وشکر اور استغنا کے ساتھ اس کا تحمل کر رہے ہیں، ان ہی حالات اور شیخ الازہر کی پیشکش ہی کے زمانے میں کویت کی طرف سے موسوعہ فقہیہ کی ترتیب کے لیے وہاں سے آپ کے پاس نہایت اونچی تنخواہ اور رہائشی سہولیات کے ساتھ کویت میں قیام کے لیے دعوت آئی، تو ملاقات ہونے پر احقر نے عرض کیا کہ حضرت آپ کویت والی دعوت قبول کیوں نہیں فرمالیتے ؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمھاری ہی طرح دوا اور دنیا داروں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا، پھر فرمایا کہ مولوی یحییٰ! یہ صحیح ہے کہ اگر میں وہاں چلا جاؤں تو تمھاری خانقاہ کے احاطے سے بڑا میرا احاطہ ہو جائے گا، مصر کے لیے شیخ الازہر کی پیشکش پر بھی میں نے وہاں جانے کی ترغیب دینی چاہی تو اس وقت بھی اسی طرح بے نیازانہ جواب دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت اعظمیؒ نہ صرف قناعت واستغناء بلکہ غیرت وخودداری کے بھی نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔(ایضاً ص ۳۷،۳۱)''

حسن اخلاق:

درج ذیل واقعات راقم سطور کے ذاتی مشاہدات ہیں جنھیں آپ پڑھ کر حضرت امام ربانیؒ

کے عظیم الشان اخلاق کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو صحیح معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی جانشین کے ہی اخلاق ہو سکتے ہیں۔

ا:- جس وقت نند گنج غازیپور میں راقم سطور کا مطب تھا، حضرت امام ربانیؒ مئو سے بنارس جاتے اور لوٹتے وقت اکثر و بیشتر اس ناچیز کے مطب میں قدم رنجہ فرماتے اور خدمت کا موقع عنایت فرماتے اور مطب کی ایک معمولی بنچ پر بے تکلف لیٹ کر استراحت فرماتے۔ شہنشاہ علم و زہد کی یہ تواضع قابل دید تھی۔

۲:- ایک مرتبہ غازیپور میں جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے حضرت امام ربانیؒ تشریف لائے ہوئے تھے، ماہر امراض چشم ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری کے گھر پر قیام تھا۔ ہم لوگ تقریباً ۷-۸ نفر نند گنج سے حضرت سے ملاقات کی غرض سے حضرتؒ کی قیام گاہ پر حاضر ہوئے، حضرتؒ کے لیے ایک کپ چائے آئی۔ حضرت نے ایک یا دو گھونٹ پی کر چائے کی پیالی ناچیز کی طرف بڑھا دی اور فرمایا کہ میرے لئے اتنی کافی ہے، ہم لوگوں نے ایک ایک دو دو گھونٹ بطور تبرک پی کر ختم کر دیا۔ غور فرمائیں مسافرت میں بھی لوگوں کی دلجوئی کا کس قدر اہتمام ہے۔

۳:- ایک بار حضرتؒ بنارس سے واپس ہوتے ہوئے نند گنج مطب میں تشریف لائے حضرت کو استنجا کی حاجت تھی، فراغت کے لیے مطب کے قریب ایک غیر مسلم کے گھر لے گیا، فارغ ہونے کے بعد جب حضرت کو لے کر باہر آیا تو دیکھا کہ کار حضرتؒ کو لینے کے لیے گھر کے باہر کھڑی ہے، تب مجھے احساس ہوا کہ حضرتؒ کو ضعف زیادہ ہے اور دور چلنا پڑ گیا، بہت زیادہ ندامت کا احساس ہو، الیکن حضرت کے چہرے پر کسی قسم کے ناگواری کے آثار نہیں تھے۔ مئو حاضر ہونے پر احقر نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرتؒ کو تکلیف ہوئی معاف فرمائیں گے۔ فرمایا تکلیف تو ہوئی لیکن کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اب بھی جب کبھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو عجیب کیفیت ہوتی ہے اور حضرتؒ کے اخلاق کریمانہ یاد آتے ہیں۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

۴:- ۱۹۸۴ء میں مئو میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، بہت سے مسلمان جیل میں تھے۔ اس کے بعد مئو حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ناچیز کی موجودگی میں ایک صاحب بقیہ صفحہ ۶۰ پر

اسلامی کتب خانے

(تیسری قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی ترجمہ وتلخیص: مسعود احمد الاعظمی

کتب خانۂ اسکندریہ عرصۂ دراز تک منارۂ علم ومعرفت اور ثقافتی زندگی کا مرکز رہا، اس نے انسانی زندگی کی تاریخ میں اہم کردارادا کیا، یونانیوں کے ذخیرے اور گزشتہ قوموں کے ترجموں کی حفاظت کی، اور ایک ایسا چشمہ شیریں رہا جس سے زمانۂ قدیم کے ارباب فکروادب سیراب ہوتے رہے، تا آنکہ تباہی وبربادی کے ہاتھوں نے اس کو اپنی گرفت میں لے لیا، اور وہ خزانے جس کے دروازے میدان علم ومعرفت کے رہ نوردوں کے لیے کھلے رہے، تاخت وتاراج کردیے گئے، اس کے سرمائے تباہ وبرباد کردیے گئے، اور یہ کتب خانہ جس انجام سے دوچار ہوا اس کے متعلق متضاد افسانے وجود میں آئے۔

اس کتب خانے کے انحطاط کا آغاز اس عام انحطاط کے ساتھ ہوا، جس سے بطالمہ کی قوم اپنے اخیر دور میں دوچار ہوئی، مصر کے حالات انحطاط پذیر ہوگئے، اس کی تہذیبی حالتیں زوال کا شکار ہوگئیں، حتی کہ اس کے سقوط میں ایک برس یا چند برسوں کا وقت بھی نہیں لگا، اس کا آغاز اگرچہ ولادت مسیح سے چند برس پہلے ہوا تھا، مگر کتب خانے کی بربادی پر مہر ولادت مسیح کے چار سال بعد ہی لگ گئی۔

۴۸ قبل مسیح میں جولیس قیصر مصر پر حملہ آور ہوا، اور آخری بطلسی حکمراں قلوپطرہ اور اس کے مخالفین کے درمیان ہونے والی آویزشوں میں شریک رہا، اس جنگ کے دوران اس نے تقریباً ۱۲۰ مصری بحری بیڑوں کو نذر آتش کیا۔ یہ آگ دور دراز تک پھیلتی رہی حتی کہ اس کے علاقۂ شاہی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور بہت سی عمارتوں کو نگل گئی، منجملہ ان عمارتوں کے ''برکیوم'' کا کتب خانہ بھی تھا، اس لائبریری کے خسارے کا اندازہ ۴۰۰۰۰ چالیس ہزار مجلدات تک لگایا جاتا ہے، اور یہ کتب خانے کا پورا سرمایہ تھا۔

مگر اس حادثے میں ''سیرابیوم'' کے کتب خانے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، لہذا ''سیرابیوم'' کا

چھوٹا کتب خانہ فکری سرگرمی کا مرکز اور اہل علم کے اجتماع کا سینٹر بن گیا۔ تیسری صدی عیسوی میں مصر کے عیسائیوں کو بت پرست رومن ایمپائر کے ظلم وستم کا شکار ہونا پڑا، پھر ایک وقت آیا کہ عیسائیت کو بت پرستوں پر فتح حاصل ہوئی، جس کے بعد انھوں نے بت پرستوں کو ان ہی مظالم کا نشانہ بنایا جن کا اس سے پہلے وہ خود سامنا کر چکے تھے، اور چونکہ مذکورہ بالا کتب خانے کی بیشتر کتابیں صنم پرستی کے دور کی تھیں، اس لیے وہ بھی حملہ آوروں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوئیں، اور بڑے کتب خانے کی تباہی کے بعد چوتھی صدی عیسوی کے گزرنے سے پہلے ہی پہلے سیرابیوم کے عبادت خانے سے ملحق دوسرا اور چھوٹا کتب خانہ بھی تباہ وبرباد ہو کر قصۂ پارینہ بن گیا۔

اس طرح عہد قدیم کا سب سے مشہور کتب خانہ ناپید اور بے نام ونشان ہو گیا، اور اس کے حالات صدیوں تک معرض خفا میں رہے۔

اس سلسلے میں آخری اور ضروری بات رہ گئی ہے، اور وہ یہ کہ بعد کے بعض عرب مؤرخین، اور ان کے منہج پر چلنے والے عصر حاضر کے بعض یورپین مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ کو نذر آتش کرنے والے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے، اور افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض عرب مؤرخین نے اس خیال کو ہوا دی ہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ کی آتش زنی خلیفۂ راشد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی ہے، ان مؤرخین میں مسلم عربی طبیب عبداللطیف بغدادی (۱۱۶۲-۱۲۳۱ء) ہیں، جو بغداد سے اسکندریہ کی زیارت کے لیے آئے، اور اس وقت اپنی کتاب ''الموعظة والاعتبار'' میں عربی مؤرخ محبّ الدین ابوالحسن علی بن یوسف قفطی (۱۱۷۲-۱۲۴۸ء) کا یہ قول نقل کیا کہ: ''جب عمرو بن عاص - رضی اللہ عنہ - شہر اسکندریہ میں فاتحانہ داخل ہوئے، تو وہاں کے ایک عالم ''یوحنا فیلوبونوس'' معروف بہ ''یحییٰ نحوی'' سے ان کا تعارف ہوا، حضرت عمرو بن عاص اس سے متاثر ہو گئے، اور اس کو قریب کر لیا، مذکورہ بالا عالم نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کتب خانۂ اسکندریہ کی کچھ کتابوں کے لیے اجازت مانگی، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے خلیفة المسلمین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس کی اجازت طلب کرنے کے لیے خط لکھا، حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں تحریر کیا کہ: ''وہ کتابیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے، اگر ان میں جو باتیں لکھی ہیں وہ کتاب اللہ کے موافق ہیں، تو کتاب اللہ میں ان سے بے نیازی

ہے، اور اگر ایسی باتیں ہیں جو کتاب اللہ کے موافق نہیں ہیں، تو پھر ان کتابوں کی کوئی حاجت نہیں ہے، اس لیے ان کو نیست و نابود کر دو''۔[۱] چنانچہ حضرت عمرو بن العاص -رضی اللہ عنہ- نے ان کو اسکندریہ کے حماموں میں جلانے کے واسطے پھینکنا شروع کیا۔

اس قصے کو قفطی نے بیان کیا ہے، اور ابوالفرج بن العبدی نے اس کو نقل کیا ہے، اس کا نام ابوالفرج جریجوری بن ہارون ابوالفرج ملطی نصرانی (۱۲۲۶-۱۲۸۶ء) ہے، اس کا باپ مسیحیت اختیار کرنے سے پہلے یہودی طبیب تھا، ''ابن العبدی'' اس کی کنیت تھی، وہ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کے مؤرخین میں تھا، اس روایت کو اس سے یا قفطی سے متعدد مؤرخین نے نقل کیا، جیسے اسماعیل ایوبی (۱۲۷۳-۱۳۳۱ء)، مقریزی (۱۳۶۴-۱۴۴۲ء) نے، عصر حاضر میں اس روایت کی تائید کرنے والوں میں سب سے مشہور جرجی زیدان ہے، جس نے اپنی کتاب ''**تاریخ التمدن الاسلامی**'' میں اس بحث کو اٹھایا ہے۔ لیکن بیشتر مؤرخین اور عرب و مسلمان محققین اور بہت سے مستشرقین[۲] نے تاریخی حقائق، منطقی دلائل اور واقعات و مسلمات کی روشنی میں ان کے دعووں کا رد کیا ہے، چنانچہ اس دعوے کے اثرات خدا کے فضل سے بہت حد تک زائل ہو چکے ہیں[۳]۔

---

(۱) عواد کورکیس، **مکتبة الاسکندرية: تاريخها وإحراقها**: ۱۴، جمال الدین القفطی، تاریخ الحکماء، تحقیق: جولیس لیبرت: ۳۳۵

(۲) مثال کے طور پر:

الف:- ریسلر جاک نے اپنی کتاب ''**الحضارة العربية**'' (تعریب: خلیل احمد خلیل) نے صفحہ ۱۰۶-۱۰۷ پر اس واقعے کا انکار اور ان کے دعوے کا رد کیا ہے۔

ب:- انگریز مؤرخ اور **Roman Empire** کے مصنف نے بھی شدت سے اس کا رد و انکار کیا ہے۔

ج:- فرانسیسی رائٹر ''کازنوفا'' نے اس واقعے کی تحقیق کرتے ہوئے فرانس کی فنون لطیفہ (فائن آرٹ) اکیڈمی کے سامنے اس کے ایک اجلاس میں مارچ ۱۹۲۳ء میں ایک بیان پیش کیا ہے، اس میں اس واقعے کی نسبت لکھا ہے کہ وہ کچھ سیاسی محرکات کے تحت گھڑا گیا ہے، اس مقالے کو سعودی عرب کے **المجلة العربية** نے معمولی تصرف کے ساتھ ۱۳۹۶/۱۳۹۷ھ کے تیسرے شمارے میں شائع کیا ہے۔

د:- عباس محمود عقاد نے اپنی کتاب ''**عبقرية عمر**'' میں اس واقعے سے متعلق تمام اقوال پر بحث کرتے ہوئے اس کا رد کیا ہے۔

(۳) حسب اللہ سید، **تاريخ الكتب والمكتبات عبر الحضارات الإنسانية: ۱۱۶**

الحلوجي عبدالستار، لمحات من تاريخ الكتب والمكتبات: ۲۰

الصوفي عبداللطيف، لمحات من تاريخ الكتب والمكتبات: ۱۵۲

القنديجلي، عامر إبراهيم وآخرون، الكتب والمكتبات: ۵۳

كحيلة نسيبة عبدالرحمن، مقدمة في تاريخ الكتب والمكتبات: ۴۳

وہ اہم حقائق جن سے اس داستان کا بے سروپا اور دروغ بے فروغ ہونا ثابت ہوتا ہے، حسب ذیل ہیں:

الف:- کتب خانۂ اسکندریہ اور برکیوم کی اکیڈمک لائبریری ۴۸ء قبل مسیح میں جولیس قیصر کے مصری بحری بیڑے کی آتش زنی کے وقت یعنی مصر کی اسلامی فتوحات سے تقریباً ۷۰۰ سال پہلے جل کر ختم ہو چکی تھی؛ اور سیرابیوم کے معبد کا کلیکشن ۳۶۶ء میں معبد کے ساتھ مذہبی لڑائیوں کے دوران تہس نہس ہوا، یعنی اسلامی فتوحات سے کم از کم اڑھائی صدی پیشتر۔

ب:- یحیی نحوی جس سے بغدادی نے واقعے کو نقل کیا ہے، حضرت عمرو بن العاص- رضی اللہ تعالی عنہ- کے اسکندریہ میں وجود کے وقت بقید حیات نہیں تھا، اگر اس کے زندہ ہونے کو صحیح فرض کرلیا جائے تو اس کی عمر اس وقت ۱۲۰ سال رہی ہوگی۔

ج:- حنا مسکوس اور سفرینوس نے اسلامی فتوحات سے پہلے مصر کی زیارت اور اس کا مشاہدہ کیا، اور وہاں کے کتب خانوں کے بارے میں بہت مفصل گفتگو کی، لیکن کتب خانۂ اسکندریہ کا تذکرہ تک نہیں کیا، اگر اس وقت وہ موجود ہوتا، تو ان دونوں کا اس کو ذکر نہ کرنا خلاف عقل ہوتا۔

د:- پانچویں اور چھٹی صدی کے تاریخ نویسوں نے اس کا تذکرہ حتی کہ اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے، ساتویں صدی کے اوائل تک کے لوگوں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اگر اس وقت کتب خانہ موجود ہوتا تو اس کی نسبت ضرور گفتگو کرتے۔

ہ:- مؤرخ وادیب یوحنا نا تیوس مصر کی اسلامی فتوحات کے وقت موجود تھا، اور اس پر گفتگو بھی کی ہے، مگر کتب خانے کے جلائے جانے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، تو کیا عقل اس بات کو باور کرسکتی ہے کہ اگر اتنا اہم واقعہ پیش آیا ہوتا تو وہ اس سے چشم پوشی کرتا، اور اس سے خاموشی کے ساتھ گزر جاتا۔

و:- کتب خانہ اسکندریہ کے بیشتر نوشتے باریک چمڑوں کے تھے، اور معلوم ہے کہ یہ جلانے کے قابل نہیں ہوتے۔

ز:- اس روایت کی تکذیب کے لیے سب سے بڑی دلیل مذہب اسلام کی فطرت ہے۔ اسلام علم سے محبت رکھنے والا مذہب ہے، اور کتابوں کو جلانا اسلام کے ان نظریات سے جو طلب علم اور

اکرام علماء کی ترغیب دیتے ہیں یکسر متصادم ہے، اور یہ اسلام کی وہ تعلیم ہے جو اسلامی قلمرو کی وسعت کے بعد امراء وحکام کی سرگرمیوں پر عکس انداز ہوئی، اور انھوں نے تدوین وتالیف اور کتابوں کی فراہمی اور عربی زبان میں ان کے ترجمہ میں دلچسپی لی، اسلام کی اس خصوصیت کی نسبت جرمن مستشرق خاتون زیفرید ہونکہ لکھتی ہے:

''۶۴۲ء میں جس وقت عرب اسکندریہ میں داخل ہوئے، تو وہاں زمانۂ دراز سے کوئی بڑا عام کتب خانہ نہیں تھا، اور ان کے سپہ سالار عمرو بن عاص پر جو کتب خانۂ اسکندریہ کو نذرِ آتش کرنے کی تہمت لگائی جاتی ہے، اور جس کو آج تک اسلام کی خوفناک ودہشتناک اور وحشیانہ تصویر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، تو بارہا اور طویل بحثوں کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ محض افترا اور بے بنیاد اور یکسر غلط ہے۔''

پھر اس خاتون نے حضرت عمرو بن العاص -رضی اللہ عنہ- کی فتوحات کے دوران ان کے تسامح اور رواداری کی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں۔ کہ انھوں نے اپنی فوجوں پر لوٹ مار اور تخریب کاری کی پابندی لگادی۔ اس خاتون نے اپنی تحریر کو اس جملے پر ختم کیا ہے کہ ''انھوں نے -عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے- ایسا عملی ثبوت پیش کیا جو مستشرقین، متقدمین اور مسیحیین سب کی سمجھ سے بالاتر تھا''۔

یہ یورپین خاتون اپنی اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ عربوں اور مسلمانوں کی کاوشوں، اور علوم ومعارف کی حفاظت اور فروغ کے لیے انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں، ان کی مدح سرائی اور تحسین وستائش کرتے ہوئے لکھتی ہے: ''عربوں نے جو کر دکھایا ہے وہ درحقیقت ایک انقاذی (حفاظتی) عمل ہے، جس کا علم کی تاریخ پر گہرا اور زبردست اثر مرتب ہوا ہے، آج تہذیب وتمدن کی جو بہار نظر آرہی ہے، اس کے لیے انسانیت پر فرض ہے کہ وہ عربوں کا اور ان کی علم دوستی کا شکریہ ادا کرے''۔

مذکورہ بالا معروضات سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ کتب خانۂ اسکندریہ کی آتش زنی کے سلسلے میں مسلمانوں پر جو تہمت چسپاں کی جاتی ہے، حقیقت وصداقت سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اور تاریخی واقعات وحقائق کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کتب خانہ مع اپنی دونوں شاخوں کے مصر کی اسلامی فتوحات سے مدتوں پہلے پوری طرح نیست ونابود ہو چکا تھا۔

وہ بیشتر یورپین مؤرخین جنھوں نے اس من گھڑت افسانے کی تصدیق کی ہے، اوراس کوصحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، تو اس کا محرک ایک طرف تو عربوں کے خلاف ان کا جذبۂ بغض وحسد تھا، اور دوسری طرف اس جھوٹ کا سہارا لے کر وہ اس آتش زنی کی پردہ پوشی کرنا چاہتے تھے، جو پہلی صلیبی جنگ کے دوران ۱۰۰۹ء میں طرابلس الشام کے عظیم الشان کتب خانۂ بنی عمار میں صلیب بردار عیسائیوں نے کی تھی۔

اسکندریہ کے بڑے کتب خانے کے علاوہ کچھ دوسرے کتب خانے بھی تھے جو یونانی دنیا میں مشہور تھے، جیسے (چوتھی صدی قبل مسیح میں) ارسطو کا کتب خانہ، اثینا کی پبلک لائبریری، تیسری صدی قبل مسیح میں برجاموس کا مشہور کتب خانہ۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد کتب خانے تھے جنھوں نے صدیوں تک یونانیوں اور گزشتہ قوموں کے سرمائے کی حفاظت کی، یہاں تک کہ یہ ورثہ قسطنطنیہ منتقل ہوا، جہاں ان کے رومن ہمسایوں نے بھی علم ومعرفت، ادب وثقافت، اور تصانیف وتالیفات کی حفاظت میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اور تاریخ کے اس دور میں رومن قوم نے انسانی ورثہ میں اپنی حصہ داری اوراس کی حفاظت میں اپنی شرکت کا کردار ادا کیا۔

اغریقی تہذیب کے کتب خانے:

ملک روم میں وہاں کے بادشاہوں کی توجہ سے کتب خانوں کوفروغ حاصل ہوا، علم وثقافت اور کتب وتصانیف کی حفاظت میں ان کی دلچسپی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ ایک صدی قبل مسیح میں رومن قوم کا ستارہ دنیائے قدیم کی سب سے بڑی سیاسی طاقت کی حیثیت سے چمکا، اور وہ اسکندر کی قدیم شہنشاہیت کے وارث ہوئے، انھوں نے حکمرانی میں یونان کو اگرچہ اپنے زیرنگیں کرلیا، لیکن تہذیب وثقافت کے میدان میں ان کی حیثیت اغریقیوں کے تلامذہ کی تھی۔ اوران کی سب سے بڑی اچھائی شاید یہ کہی جائے کہ انھوں نے کسی انقطاع کے بغیر تہذیب وثقافت کے دھارے کی روانی میں مدد کی۔

اس لیے بہت سے مؤرخین کا خیال یہ ہے کہ اس حکومت کے کتب خانوں اور کتابوں کی تاریخ، یونانیوں کے شانہ بشانہ تھی، اور وہ اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں یونانی تہذیب سے متاثر ہوئے، اس کی نقل کی، اوراس کو اختیار کیا، یہ چیز کتب خانوں کے میدان میں بہت وضاحت سے ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ رومن کتب خانے اپنے نظم وضبط، اغراض ومقاصد اور خدمات کے لحاظ سے یونانی

کتب خانوں سے بدرجۂ اتم مشابہت رکھتے تھے۔

دوسری صدی قبل مسیح کے وسط سے رومن سپہ سالار جب روما واپس ہونے لگتے تو اپنے ساتھ کتابیں لایا کرتے تھے، جس نے رومن تہذیب پر زبردست اثر ڈالا، رومن باشندوں میں کتابت کا میلان پیدا کیا، اور کتابوں کے احترام کا جذبہ پروان چڑھایا، یہاں تک کہ پہلی صدی قبل مسیح تک رومن اسٹیٹ میں کتابوں کی محبت عام ہوچکی تھی، ان میں سرفہرست سیشروں **Cieron** (۱۰۶-۴۳ ق م) تھا، جو رومن قوم کا سب سے زبان آور مقرر اور مشہور ترین سیاست داں تھا، جو اپنے کلیکشن پر فخر کیا کرتا تھا، اور ایسے متعدد معاونین سے کام لیا کرتا تھا، جو فقہ اللغۃ پر پوری دسترس رکھتے تھے، جیسے مشہور رومن محقق اسکالر ''مارکورس فارو'' (۱۱۶-۲۷ ق م) جس نے ''کتب خانوں کے متعلق'' کے عنوان سے ایک رسالہ تالیف کیا تھا۔

رومنوں نے لاتینی حروف تہجی کے اعتبار سے مشق کتابت کی، جو بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی ہے، یہ طریقۂ کتابت اصلاً فینقی ہے۔ انھوں نے کتابت کے واسطے کے طور پر بردی کے پتوں کا استعمال کیا، اور اس کی خام صورت کو **Charta** کا نام دیا، اور بردی کے تہ دار لفافوں کا **Voluma** نام رکھا، وہ لوگ اس کے صرف ایک طرف لکھتے تھے، اسی طرح انھوں نے بانس سے تیار کیے ہوئے قلموں کا استعمال کیا، وہ لفافے **Capra** نام کے معدنی صندوقوں میں محفوظ کیے جاتے تھے، وہ الماریوں پر عمودی شکل میں رکھے جاتے تھے، اور شناخت کی سہولت کے لیے ان پر چھوٹے چھوٹے تراشے یا پرچیاں لگادی جاتی تھیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرائیویٹ اور مخصوص کتب خانے، نیز وہ کتب خانے جو قوم کے اعلی افراد، یعنی حکمرانوں، فوجی سالاروں وغیرہ کے محلات سے ملحق کتب خانے، رومن تہذیب کے اولین کتب خانے تھے، پھر دوسری صدی قبل مسیح تک کتب خانہ ایک وجہ امتیاز بن گیا، اور چھٹی صدی عیسوی کے اوائل تک روما تعلیم یافتہ طبقے کی دلچسپیوں کا مرکز، اور کتابوں کی فراہمی اور اس کا اہتمام ان کی توجہ کا مرکز ہوگئی۔

اور پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں عام کتب خانوں (پبلک لائبریریوں) کے قیام کی کوشش شروع ہوگئی، یہ کوشش جولیس قیصر (۱۰۰-۴۴ ق م) کی طرف منسوب کی جاتی ہے، اس کو کتابوں اور

کتب خانوں کا بہت اہتمام تھا اور اس باب میں وہ ہیلنسی کلچر سے متاثر تھا، مگر یہ کہ ۴۴ قبل مسیح میں اس کے منصوبوں کے شرمندۂ تعبیر ہونے سے پہلے ہی اس کو قتل کر دیا گیا۔

قیصر کے وارث اور جانشین فرمانروا اگسٹس (۲۸ قبل مسیح) کے عہد میں ۳۷ قبل مسیح میں روما میں پہلے عام کتب خانے کا قیام عمل میں آیا، اس بادشاہ نے دو اور کتب خانوں کی بھی بنیاد رکھی، ایک یونانی کتابوں کے لیے اور دوسرا لاتینی کتابوں کے واسطے۔(۱)

کتب خانوں کے ساتھ رومن قوم کی دلچسپی روز افزوں رہی، اور چوتھی صدی عیسوی ابھی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ صرف روما میں ۲۸ عام کتب خانے (پبلک لائبریریاں) تھے۔(۲)

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ۵۲ کا بقیہ حضرتؒ کو دعوت دینے آئے تھے حضرت نے ان صاحب سے فرمایا کہ بہت سے لوگ جیل میں بند ہیں اور دعوت کھانے سے انکار فرمایا۔ اس واقعہ سے حضرتؒ کی شفقت علی الخلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۵:- مظہر العلوم بنارس میں ختم بخاری کی تقریب تھی، حضرتؒ نے مئو سے بنارس جاتے ہوئے احقر کے مطب کے سامنے گاڑی رکوائی اور فرمایا کہ آج مظہر العلوم میں بخاری کا ختم ہے، احقر نے عرض کیا کہ حضرتؒ حاضر ہوں گا۔ حضرتؒ کی محبت کو کیا کہوں صرف اتنی اطلاع فرما کر تشریف لے گئے۔

۶:- ایک بار مئو حاضر خدمت ہونے پر حضرتؒ نے اپنی تالیفات ''**التنقید السدید**'' ''**دفع المجادلة**'' اور ''ارشاد الثقلین'' عنایت فرمائیں، جو حضرتؒ کی محبت کی یادگار ہیں اور ناچیز کے پاس محفوظ ہیں۔

---

(۱) بیسیل الفرڈ: تاریخ الکتاب، ص:۱۰

(۲) حلوجی عبدالستار: لمحات من تاریخ الکتاب والمکتبات:۳۱

جزیرہ قوصرہ

(دوسری قسط)

از مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی رحمۃ اللہ علیہ

قوصرہ سے مسلمانوں کی ہجرت صقلیہ، مالطہ اور دوسرے جزیروں کی طرح قوصرہ بھی برابر نارمن حکومت کے زیر اقتدار رہا، یہاں تک کہ ایک جرمن خاندان ہوہنشطوفن (**Hohenstaufen**) نے نارمنوں سے حکومت چھین لی اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ یکسر بدل گیا، مسلمانوں پر ناقابل برداشت مظالم کا آغاز اسی خاندان کی حکومت سے ہوتا ہے۔ بالآخر جرمنوں اور ان کے بعد آنجو (**Anjou**) کے جانشینوں کی ستم رانی سے تنگ آکر ان جزائر کے مسلمانوں نے افریقہ اور تونس کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت افریقہ میں موحدین اور بنوحفص برسر اقتدار تھے، ان ستم رسیدہ مہاجرین کا استقبال گرم جوشی سے کیا گیا اور ان کی آبادکاری کے سلسلہ میں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی گئی۔ ان مہاجرین میں ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے، چنانچہ سپاہیانہ جوہر رکھنے والوں کو افریقہ کی فوج میں، زراعت پیشہ لوگوں کو زراعت کے میدانوں میں اور علوم وفنون کے ماہرین کو افریقہ وتونس کے علمی حلقوں میں کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ انھیں میں ادریسیوں کا ایک مشہور خاندان آل الصقلی بھی تھا جو تونس میں فن طب کے مخصوص ماہرین کا خاندان تھا اور بہت ممکن ہے یہ خاندان مشہور علامہ الشریف الادریسی کی ذریت ہو۔

مدجنین یا مسلمانوں کی باقی ماندہ جماعت مہاجرین جو تونس اور افریقہ میں پناہ لینے آئے تھے، ان میں زیادہ تر مستطیع اور متمول خانوادے تھے ورنہ نادار و کمزور مسلمانوں کا طبقہ تو اپنے قدیم وطن ہی میں عیسائیوں کے ظلم وتعدی کا نشانہ بنا ہوا بے بسی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

ان ضعفائے مسلمین ہی کے خیال سے امرائے دولت حفصیہ اپنی قوت وشوکت کے دور میں ان جزیروں کے سیاسی امور میں مداخلت کرتے رہے۔ اور عیسائی فرمانرواؤں کو ان کی مسلم کش پالیسی

پر برابر تنبیہ وتہدید سے کام لیتے رہے، یہاں تک کہ اخیر میں ابوزکریا الاکبر اور فریڈرک ثانی کے مابین ۱۵/ جمادی الآخرہ ۶۲۸ھ مطابق ۲۰/ اپریل ۱۲۳۱ء کو ایک معاہدہ ہوا جس کی مدت دس سال کے لیے تھی، اس معاہدہ کی رو سے دولت حفصیہ نے جزیرہ قوصرہ پر فریڈرک کی بالا دستی اس شرط پر تسلیم کی تھی کہ قوصرہ کا نصف محصول سالانہ، تونس کی (اسلامی) حکومت کو ملتا رہے، نیز اس صلح نامہ کی صریح دفعہ یہ تھی کہ فریڈرک کے قلمرو میں جو مسلمان مقیم ہیں ان کے مذہبی اور دینی عقائد کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھا جائے اور مسلمان شرعی عرفی احکام ورسوم کی ادائیگی میں بالکل آزاد ہوں گے، امیر ابوزکریا کی زندگی تک اس معاہدہ کے دفعات کے مطابق برابر عمل ہوتا رہا، یہ معاہدہ امیر موصوف کی تاریخ حیات کا نہایت روشن کارنامہ تھا۔ امیر ابوزکریا کی وفات کے ساتھ ہی عیسائیوں کی روش مسلم رعایا (مدجنین) کے ساتھ یکسر بدل گئی اور معاہدہ کی خلاف ورزی شروع ہوگئی چنانچہ ابن خلدون اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ:

''امیر[1] ابوزکریا کی وفات ۲۳/ جمادی الاخری ۶۴۷ھ=۴/ اکتوبر ۱۲۴۹ء کی خبر جب صقلیہ پہنچی تو یہاں کے مسلمان جو شہر پلرمو میں آباد اور سلطان موصوف اور فرمانروائے جزیرہ کے معاہدہ کی رو سے سکون واطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے، سلطان کی وفات کی اطلاع پاتے ہی اہل مسیحیت ان پر ٹوٹ پڑے اور مسلمانوں کو قلعوں اور محفوظ مقامات میں سمٹ آنا پڑا۔ ان لوگوں نے بنوعبس کے ایک جوشیلے بہادر کو اپنا سردار بنالیا۔ شاہ صقلیہ نے ان قلعہ بند مسلمانوں کا محاصرہ کرلیا اور آخر الامر ان کو قلعہ سے نکلنے پر مجبور کردیا۔ اس جماعت کو سمندر پار ایک مقام[2] لوجارہ (Lucera) میں رکھا گیا اس کے بعد مالطہ اور قوصرہ کے مسلمان بھی پکڑ کر یہیں لائے گئے، صقلیہ اور ان چھوٹے جزیروں پر عیسائی مستولی ہوگئے اور یہاں سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹادیا گیا''۔

ابن خلدون کے مذکورہ بیان کے بعد قارئین کو یہی گمان ہوگا کہ ان جزیروں اور علی الخصوص

---

(۱) تاریخ ابن خلدون: ج۱ص ۴۰۹ (الجزائر)

(۲) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا بیان ہے کہ بیس ہزار عرب، لوجارہ پہنچائے گئے تھے، شروع میں ان کو اپنے مذہب پر چھوڑ دیا گیا تھا لیکن ۱۳۰۰ء میں اکثر وبیشتر قتل کردیئے گئے اور ان میں سے جو لوگ مجبوراً عیسائی ہوگئے وہی باقی بچے (دیکھو ج ۱۴ص ۴۵۸، ۲۹واں ایڈیشن۔ لفظ Lucera

ہماری بحث کے اصل موضوع جزیرہ قوصرہ سے مسلمانوں کے تعلقات بالکلیہ ختم ہوگئے ہوں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان نوآبادیوں سے اہل افریقہ کے روابط مذکورہ بالاخونچکاں وقائع کے بعد بھی کسی نہ کسی جہت سے باقی رہے تھے۔ جب تک دولتِ حفصیہ کا وجود باقی رہا افریقہ کے مسلمان قوصرہ میں اقامت اور وہاں کی آمدورفت سے باز نہ رہے۔ چنانچہ ہماری تائید ابن فضل اللہ العمری کے اس بیان سے ہوتی ہے جو پہلے مذکور ہوا۔ اور اس کے الفاظ ہم مکرر پیش کرتے ہیں: **وبھا جماعة من المسلمین تحت الذمة علی مقرر لھم**. یعنی قوصرہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت مسیحیوں کے ماتحت جزیہ دے کر رہتی تھی۔ اس سے پیشتر ابن سعید غرناطی جس کے زمانہ میں ان جزیروں کے مسلمانوں پر عیسائیوں نے مظالم برپا کر رکھے تھے اس کا بیان بھی یہی ہے، کہ قوصرہ کے مسلمان صقلیہ کے فرنگیوں کے ماتحت رہتے تھے اور انہی مسلمانوں کو افریقہ کے مسلمان مدجن اور اسپین کے عیسائی Mudejare کہتے تھے۔ پھر نویں صدی ہجری میں قاضی ابوالقاسم بن ناجی القیر وانی (م رجب ۸۳۹ھ = جنوری ۱۴۳۶ء) کے ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بھی قوصرہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی مخلوط آبادی تھی۔ اس وقت اس جزیرہ پر اسپین کے عیسائیوں کا قبضہ تھا اور یہاں کے مسلمانوں کے لیے دینی اور شرعی احکام کے فیصلہ کے لیے ایک قاضی کا تقرر ہوا کرتا تھا۔ قوصرہ کے مسلمان افریقہ کے بندرگاہوں اور خصوصا مشرقی ساحل کے شہروں مثلاً سوسہ، المہدیہ، صفاقس، قابس وغیرہ تک آمدورفت رکھتے تھے۔ ابن ناجی کے بیان سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اسلامی قلمرو کے علماء غیر مسلم مملکتوں میں ان مسلمانوں کی بودوباش پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ قاضی موصوف کی اصل عبارت درج ذیل ہے:

وجری [1] لی، وانا قاضی بجربة. حدود سنة ۸۰۰ هـ (۱۳۹۸م) أن قدم لی رسم فیه شهادة قاضی قوصرة یذکر حق شهود من علمه. فطلب منی العارض أن أوقع علی

جربہ میں منصب قضاء پر مامور رہتے ہوئے ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) کے لگ بھگ کی بات ہے کہ میرے پاس ایک فتویٰ پہنچا جس میں قوصرہ کے قاضی نے ذاتی علم کی بنا پر دعویٰ دائر کرنے والوں کے حق میں شہادت دی تھی۔ فتویٰ پیش

(۱) شرح رسالہ ابن ابی یزید: ص ۴۰۶ طبع مصر ۱۳۳۲ھ

خطه فلم أمكن صاحبه من ذلک لأنهم (أی مسلم قوصرة) قادرون علی التحلیل فی الخروج منها وربما یخرج بعض من فیها ویعود الیها وهم تحت حکم الکفار.

کرنے والا چاہتا تھا کہ میں بھی اپنے دستخط کردوں لیکن میں باز رہا اس لیے کہ قوصرہ کے مسلمانوں کے لیے وہاں سے نکل آنا ممکن ہے چنانچہ وہاں کے بہتیرے مسلمان اسلامی علاقوں کا سفر کرتے ہیں اور پھر کافروں کی حکومت میں رہنے کے لیے واپس لوٹ جاتے ہیں۔

ابن ناجی کے بیان کی تصدیق تونس کے مشہور مفتی امام ابوالقاسم محمد بن احمد البرزلی (م ۸۴۱ھ = ۱۴۳۸ء) کے ایک فتویٰ سے ہوتی ہے جس میں مفتی صاحب موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

ومثله [1] عندنا بافریقیة أهل قوصرة، فانها تحت ایالة الکفر وقد اختار بعضهم الاقامة بها فمن غلب علیٰ امره منهم فله مندوحة ولیست بجرحة فی حقه لأنه کالمکره ومن کان باختیاره فهو جرحة وحکم ماله یجری علی ما سبق وهم –أی مسلمو قوصرة– ونحوهم من أهل الاندلس یسمون بالدجن

یہی مثال ہمارے یہاں افریقہ میں قوصرۃ کے مسلمانوں کی ہے جو کافروں کی حکومت میں رہتے ہیں۔ ان میں سے جو مغلوب و مجبور ہو کر رہ گئے ہیں ان کے لیے تو گنجائش نکل آتی ہے۔ لیکن جو وہاں سے منتقل ہو سکتے ہیں پھر بھی وہیں رہنا گوارا کرتے ہیں ان کے ساتھ مطلق رعایت نہیں۔ اور ان کے اموال کا وہی حکم ہوگا جو مذکور ہوا۔ قوصرہ اور اسی طرح اندلس میں جو مسلمان رہ گئے ہیں وہ "مدجن" کہلاتے ہیں۔

دفتری نظم و نسق قوصرہ پر عربی استیلاء کے دور میں یہاں نظام حکومت کی کیا شکل تھی، پیش نظر تاریخی مصادر سے اس مسئلہ کی وضاحت نہیں ہوتی۔ افریقہ کی اسلامی سلطنت یہاں کے لیے مستقل والی کا تقرر کرتی تھی یا جزیرۂ صقلیہ و مالطہ کے والیوں میں سے کسی ایک کے ذمہ یہاں کی نگرانی ہوا کرتی تھی۔ ان میں سے کسی شق کے متعلق بھی ہماری تاریخ کوئی قطعی ثبوت بہم نہیں پہنچاتی۔ البتہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اغلبی امراء کو اپنے قلمرو کے ہر ہر خطہ سے بڑا گہرا لگاؤ رہتا تھا اور ان کو اپنے ملک کی ترقی

(۱) المعیار للونشریسی طبع فاس ۱۳۱۴ھ نیز جامع مسائل الاحکام قلمی نسخہ مملوکہ حسن حسنی عبدالوہاب باشا

وتہذیب اور آبادکاری کے مسائل سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ ملک کے حالات کا بذات خود گہرا جائزہ لیتے تھے، تاریخ بتاتی ہے کہ امیر محمد ثانی جس کالقب ابولغرانیق تھا ایک دفعہ سوسہ کے بندرگاہ سے سوار ہوکر جزیرۂ قوصرہ پہنچا اور کئی دن یہاں ٹھہرا رہا کہ جزیرہ کے حالات اس پر عیاں ہوجائیں، اسی طرح دوسرے سلاطین بھی قوصرہ اور مابقی جزیروں مثلاً مالطہ اور صقلیہ کا سفر اسی ارادہ سے کیا کرتے تھے کہ رعایا کی شکایتیں سن پائیں اور ملک کی حالت سدھار سکیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر بعید نہیں اگر قوصرہ کے لیے مستقل عامل کا تقرر ہوتا رہا ہو جس کے ذمہ داخلی نظم ونسق اور حربی واجتماعی فرائض و واجبات کو انجام دیتا ہو، بہر حال یہاں کے قاضی شرعی کا منصب تو مستقل تھا جس کا تقرر مرکز حکومت قیروان اور بعد میں المہدیہ سے ہوا کرتا تھا۔ قوصرہ سے جب اسلامی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا تو مقامی مسلمانوں کی جماعت خود ہی قاضی کا انتخاب کیا کرتی تھی جس کو مسیحی حکومت تسلیم کرلیتی تھی اور اسی کے جاری کردہ شرعی احکام کو نافذ کرواتی تھی، اس سلسلہ میں علامہ ابن ناجی کا مذکورہ بالا اقتباس ثبوت کے لیے کافی ہے۔

نویں صدی ہجری تک اس جزیرہ میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اسی نظم کے ساتھ ہوتی رہی اور شاید دسویں صدی ہجری میں بھی اسی قسم کا انتظام رہا ہوگا لیکن نویں صدی کے بعد یہاں کے مسلمانوں کا حال انتہائی تاریکی میں ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دسویں صدی ہجری اور مابعد زمانہ میں یہاں کے ''مدجنین'' کا انجام کیا ہوا۔ اتنا متیقن ہے کہ جیسے دولت بنی حفص کی قوت پر اضمحلال کا غلبہ ہوتا گیا، افریقہ سے جزیرۂ قوصرہ کو جو مادی ومعنوی امداد وقتاً فوقتاً پہنچتی رہتی تھی اس میں نہ صرف کمی ہی آگئی بلکہ اخیر میں اس کا سلسلہ سرے سے منقطع ہوگیا، اور جزیرہ کے بے یار ومددگار مسلمانوں پر کلی اضمحلال طاری ہوگیا ایسا کہ پھر ان کا حشر معلوم نہیں کیا جاسکا۔ گمان غالب ہے کہ قوصرہ پر جب اہل اسپین کو غلبہ حاصل ہوا تو جس طرح بلاد اندلس میں ان مسلمانوں کو جو ترک وطن کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے جبراً عیسائی بنالیا گیا۔ اسی طرح قوصرہ کے مسلمانوں کو بھی تبدیلِ مذہب پر مجبور کیا گیا ہوگا۔

قوصرہ سے قریب دو جزیرے قوصرہ کے قرب وجوار کے جزیرے لمبدوشہ (Lampedusa) اور لموشہ (Limosa) جو بلاد تونس سے پورب میں واقع ہیں بظاہر قوصرہ کے ماتحت تھے اور یہاں کی مسلم آبادی کے متعلق وہی باتیں کہی جاسکتی ہیں جو خود قوصرہ کے مسلمانوں

کے بارے میں اوپر گزر چکی ہیں۔ان دونوں جزیروں کے متعلق ہمیں اسلامی مصنفین کے یہاں تمام معلومات یکجا نظر نہیں آتے البتہ ان کے نام ضمنی طور پر کتابوں میں آجاتے ہیں، ابوعبید البکری اپنی تصنیف المسالک میں ان دونوں کے نام پر اکتفا کرتے ہوئے ان کی جگہ تونسی جزیرہ قرقنہ کے سامنے یعنی مشرق میں بتاتا ہے۔عرب جغرافیہ نویسوں میں سے ادریسی کا بیان سب سے زیادہ مفصل ہے، لیکن اس کے بیان سے ان دونوں جزیروں کی تاریخ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، امام محمد بن علی المازری (م ۵۳۶ھ) کے ایک فتویٰ میں ضمناً لنبدوشہ کا ذکر آ گیا ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں المہدیہ سے اسکندریہ تک بادبانی جہازوں کے ذریعہ بحری سفر کیا کرتے تھے اور اس بحری راستہ میں کشتیوں کا ایک اسٹیشن یہی جزیرہ تھا۔

قوصرہ اور عثمانی ترک | اہل اسپین کی حکومت قوصرہ سے، آل عثمان کی بحری طاقت کے ظہور کے ساتھ زائل ہونے لگی۔ترکوں نے بحر متوسط پر غلبہ واستیلاء حاصل کر کے اسلامی بیڑے کا رعب سطح بحر پر دوبارہ قائم کر دیا۔۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) میں مشہور ترکی امیر البحر طورغود باشا نے -جس کو اہل تیونس اپنے لہجہ میں درغوث کہتے ہیں- جزیرہ قوصرہ کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ کے بحری مقبوضات میں شامل کر لیا، اور ترکی بحریہ میں اہم مرکز بنا دیا تھا۔جب تک ترک المہدیہ پر قابض رہے قوصرہ بھی ان کے زیر اقتدار رہا۔ یہاں کے مالطہ کے سواروں کی جماعت یعنی استباریہ اس جزیرہ پر قابض ہو گئی اور انگریزوں کی آمد تک یہاں اہل مالطہ کا تسلط قائم رہا۔انگریزوں کا قبضہ مالطہ اور اس کے ملحقات پر ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں قائم ہوا۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ آخری ادوار میں مسلمانوں کی جماعت یہاں باقی بھی رہی تھی یا سب کو اسپینی مسیحیوں اور استباریہ کے زیر اثر تبدیلِ مذہب پر مجبور ہونا پڑا۔ بظاہر آخری شق کا احتمال غالب ہے لیکن یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس جزیرہ کے بسنے والوں کی زبان مسیحیت کے اقتدار مطلق کے باوجود عربی زبان تھی اور ان لوگوں کا لباس تو قریبی زمانہ تک تونسی علاقوں کے لباس سے ملتا جلتا تھا۔

قوصرہ اور لغۂ عربیہ | سترہویں صدی عیسوی کا ایک فرانسیسی سیاح جان بونی (Joan Bonnet) مرادبین کے عہد میں ۱۶۶۹ء سے ۱۶۷۰ء تک (۱۰۸۰ھ سے ۱۰۸۱ھ) تونس میں گرفتار رہا پھر بندرگاہ سوسہ سے ایک بادبانی جہاز پر سوار ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔اس نے اپنے

سفرنامہ میں تونسیوں کے قید سے فرار کی داستان سناتے ہوئے جزیرہ قوصرہ (بنطلاریہ) گزرنے کا ذکر کیا ہے۔ قوصرہ پہلا فرنگی مقبوضہ تھا جہاں اس کو تونس سے فرار ہونے کے بعد دم لینے کا موقع ملا تھا، یہاں اسے ایک ترجمان کی ضرورت پڑ گئی، چنانچہ مالطہ کے ایک شخص نے اس خدمت کے لیے آمادگی ظاہر کی اس لیے کہ قوصرہ کی زبان عیسائیوں کے عہد میں بھی مالطہ کی زبان سے مشابہ تھی۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عربی زبان قوصرہ کے مسیحیوں میں بارہویں صدی ہجری کے اوائل تک رائج رہی اور اہل قوصرہ کے بول چال کی زبان، عربی کے سوا کوئی اور یورپین زبان نہیں بن سکتی تھی۔ گرچہ ان کی عربی ویسی ہی محرف شکل کی ہوگئی ہوگی جیسی مالطہ میں زمانۂ حال تک مستعمل رہی ہے۔ یا ممکن ہے کہ قوصرہ سے بلاد تونسی کی قربت کا یہ اثر ہو کہ وہاں کی عربی اہل مالطہ کی زبان کی بہ نسبت لغۂ فصحیٰ سے قریب تر رہی ہو۔

قوصرہ کے بہت سے مقامات کے نام اصلاً عربی زبان کے ہیں، بلکہ اسی (۸۰) فیصدی ناموں کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہے۔ ہمارے بعض ایطالوی دوستوں کو حیرت تھی کہ تقریباً سات سو برس سے لاطینی بولنے والے عیسائیوں کا قبضہ اس جزیرہ پر ہے اس کے باوجود یہاں کے مقامات کے نام بالعموم عربی ہی رہے! لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ عربی فتح کا اثر کچھ اتنا پائیدار اور گہرا ہوا کرتا تھا کہ آج جہاں عربوں کا نام ونشان مٹ چکا ہے وہاں بھی مقامی باشندوں کی تہذیب وثقافت اور زبان وتمدن پر عربیت کا اثر حال تک مشاہدہ میں آتا ہے۔ اور تنہا قوصرہ ہی پر موقوف نہیں بلکہ صقلیہ، اندلس، مالطہ اور ماںقی جزیروں میں بھی عربوں کے اثرات ہویدا ہیں۔ ذیل میں قوصرہ کے بعض مقامات کے ناموں کی ایک فہرست ملاحظہ فرمائیں:

المرسی، (Limarsa)

بیت المرسی، آج کل کے استعمال میں لاطینی املاء وتلفظ کے مطابق (Beccimursa) ہے

الشرف، (Scirafe) بلند مقام

جبل، (Gibele) اس جزیرے کے سب سے بلند مقام کا نام

جبل احمر، (Gelkhamar)

الشمالیۃ، (Limillia) ایک مقام شمالی جہت میں

الغنية،(Mugna)باغ وبوستان کے معنی ہیں،اس جزیرہ کے جغرافیائی ناموں میں یہ لفظ اکثر آتا ہے۔

الحمه،(Khamma)ایک چھوٹا گاؤں جس میں گرم پانی کا ایک چشمہ ہیچ جزیرہ کے برکانی آثار میں سے ہے اسی چشمہ کی مناسبت سے یہ نام ہے۔

كدية الحمة،(Cuddia-de-Khamma)

حروشه (Caruscia)ایک سنگلاخ قطعۂ زمین کا نام۔تونس میں سنگلاخ زمین کو ’’حرش‘‘ کہتے ہیں۔

سلوم (Sollume)صحیح شکل عربی کی-سلم- ہے، پہاڑ پر چڑھنے کا راستہ واو کا اضافہ تونسی لب ولہجہ کی پوری طرح غماز ہے۔

خربه(Harbe)

زيتة(Zita)

كدية(Cuddia)ہر بلند جگہ کو کہتے ہیں۔کئی ایک مقاموں کے نام کا جزء ہے۔

الحجر (Khagiar)

أبو قرة(Buccura)گمان یہ ہے کہ کسی شخص کے نام پر اس مقام کا نام پڑا۔

كدية ابن سلطان(Cuddia Bonsultan)

بنی قائد(Beni cuad)

بويرة(Buria)لفظ بئر کی تصغیر ہے تاء تانیث کے ساتھ

بلاطة(Balata)

حنفة (Hanaka)موجودہ استعمال میں ’’حنکہ‘‘ ہے دو پہاڑوں کے درمیان تنگنائے۔

الغلقة(Zia galcha)

كدية التنورة(Cuddia attalora)

سداری(Sidere)

اس فہرست کو مزید طول نہیں دیا جاتا ہے کہ مقامات کے نام سیکڑوں کی تعداد میں عربی الاصل ہیں، موجودہ بنطلاریہ (قوصرہ) میں عربی مفردات کی کیا شکل ہوگئی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل

فہرست سے ہوگا، اگر ان تمام عربی کلمات کو جمع کیا جائے تو لغت کی ایک مستقل تالیف تیار ہوسکتی ہے۔

زبیب (Zebibo) خشک انگور (کشمش)

بیفرۃ (Befra) انجیر کا پھول، اہل تونس کی زبان میں بیثرۃ ہے یعنی فاء کے بجائے ثاء بولتے ہیں، تلفظ کی دونوں صورتیں صحیح ہیں یہ لفظ یونانی الاصل ہے۔

سواقی (Scivachi) پانی کے بہنے کی جگہ اصل میں ساقیہ کی جمع ہے۔

دکانۃ (Duccana) چبوترہ

سکارۃ اہل قوصرہ سکالۃ، بولتے ہیں قفل کے معنی ہیں ایک تونسی مثل ہے، کیف بیب کیف سکالۃ، یعنی ردی دروازہ کے لیے ردی قفل۔

جحا (Giufa) ایک مجہول شخصیت[1] کا نام، جس کی طرف مضحک حکایات اور فکاہی قصے منسوب ہیں، اہل قوصرہ حائے حلقی کے بجائے فاء کا تلفظ کرتے ہیں یعنی جفا بولتے ہیں اور کئی کلمات میں بھی حاء کو فاء سے بدل دیتے ہیں۔

داموس (Damusso) ہر قوس نما عمارت کو کہتے ہیں، یہ لفظ اسی معنی میں اہل تونس بھی بولتے ہیں۔

ساسی (Sicci) عربی لفظ اُساس کی بگڑی ہوئی صورت، ہر سنگی بنیاد کو اہل بنطلاریہ Sicci کہتے ہیں۔ جزیرہ سردانیہ میں یہ لفظ قدیم عمارات کے لیے بولا جاتا ہے۔

حربوشہ، گندھے ہوئے میدہ کی ٹکیا بنا کر گرم گرم خاکستر میں ڈال کر پکاتے ہیں۔ اسی کو تونس کے زراعت پیشہ ''خز الملۃ'' کہتے ہیں۔

مطیرۃ، وہ قطعۂ زمین جس کو ہل چلانے سے پہلے سیراب کر لیتے ہیں۔

حفیان، اس کا تلفظ حفیانو (Afiano) کرتے ہیں، جو ننگے پاؤں ہو۔

مذکورہ بالا الفاظ کے علاوہ بہ کثرت عربی الاصل الفاظ یہاں کی زبان میں داخل ہیں جن کی تحقیق اور اصل عربی شکل کو معلوم کرنا کچھ دشوار بھی ہے۔ بہر حال ہماری مختصر فہرست پر نگاہ ڈالنے کے

---

(۱) اس مجہول الحال شخص کا ذکر عربوں کے فکاہی قصوں، کہانیوں میں عام تھا چنانچہ ابن الندیم کتاب الفہرست میں ایسی ہی کہانیوں کے ایک مجموعہ کا ذکر کرتا ہے جس کا نام کتاب نوادر جحا ہے۔ دیکھو ص ۴۳۵ طبع رحمانیہ مصر۔

بعد یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ عربی زبان قوصرہ میں قریبی زمانہ تک مستعمل رہی چنانچہ ہمارا دعویٰ گذر چکا ہے۔ بعد میں یہاں کی عربی پر ایطالوی زبان یا یہ کہئے کہ صقلیہ کی زبان کا غلبہ ہوا پھر بھی کچھ الفاظ عربی کے باقی رہ گئے۔

قوصرہ کی معاشرت پر عربی اثر یہاں تک تو زبان کا معاملہ تھا، جہاں تک معاشرت کے مختلف پہلوؤں کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اہل قوصرہ تھوڑی مدت پہلے تک اہل افریقہ کے رسوم وعادات کی تقلید کرتے رہے تھے اور ان کی زندگی کے مختلف شعبوں پر افریقی اور بربر عربوں کا اثر باقی رہا تھا۔ ان کے لباس میں خاص تونسی وضع کی ٹوپی عام تھی تونسی ساحل اور جزیرہ شریک کے ادنی لبادے (قشابیہ) عموماً رائج تھے۔ تقریباً گذشتہ ایک صدی کے اندر قوصرہ اور تونس کے تجارتی تعلقات ختم ہوگئے تو تونسی وضع قطع کی جگہ ایطالوی طرز وضع نے لے لی: جزیرہ جربہ کے بنے ہوئے مٹی کے برتن مثلاً مٹکے، گھڑے، آبخورے وغیرہ یہاں کے گھروں میں عموماً مستعمل تھے۔ قوصرہ کی خواتین زمانۂ حال تک پردہ میں نکلتی تھیں، کسی کام سے گھر سے باہر نکلنا ہوتا یا کلیسا کی حاضری ہوتی تو سیاہ گلیم میں اچھی طرح لپٹی ہوئی نکلتیں اور چہرہ کا کوئی حصہ بجز آنکھوں کے نظر نہیں آتا تھا۔ تونسی ساحل کی عورتیں بھی جب گھر سے باہر نکلتی ہیں تو اسی سیاہ لبادے میں علی الخصوص شہر سوسہ کی عورتیں تو اسی وضع کی پابند ہیں۔

اسلامی عہد کے آثار قدیمہ قوصرہ کے سواحل اور ویرانوں سے خاصہ تعداد عربی سکوں کی برآمد کی گئی ہے۔ یہ سکے مختلف اسلامی حکومتوں یعنی اغالبہ، عبیدیہ اور دولت حفصیہ کے عہد کے ہیں۔ ان سکوں کی ڈھلائی افریقہ کے دارالضرب میں ہوتی تھی۔ اثری تحقیقات کے سلسلہ میں رخام اور معمولی پتھر کے الواح اور کتابے بھی جمع کیے گئے ہیں یہ کتابے اسلامی دور کی قبروں پر نصب تھے۔ اثری تحقیق کے سلسلہ میں اماری اور اورسی (Orci) کی کارگزاریاں علمی دنیا میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

اس مختصر مضمون کو پڑھ کر آپ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہوچکی ہوگی کہ اہل قوصرہ وضع قطع، زبان وبیان، صنعت وحرفت غرض زندگی کے اکثر شعبوں میں افریقہ کے عرب اور بربر مسلمانوں کے مرہون منت رہے ہیں اور اسی جزیرہ کی کیا خصوصیت ہے، صقلیہ، مالطہ اور مابقی جزائر بحر روم کو بھی عربوں سے ورثہ میں بہت کچھ ہاتھ آیا جس کا اعتراف یورپ کے اہل تحقیق صریح لفظوں میں کرنے لگے ہیں۔ انتہیٰ

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ)

مخدوم مکرم بندہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب زادعنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بعد تسلیم بصد تعظیم کے عرض ہے کہ جناب والا کا رقعہ آج ملا۔ حالات معلوم ہوئے۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کا تو ویسے بھی مجھے خیال رہتا ہے اور آنجناب کے کہنے کے بعد بھلا کیوں نہ خیال کروں گا، لیکن ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ غرض منداور اہل معاملہ ہوتے ہوئے وہ لوگ خود آنجناب کو تو تکلیف دینا گوارا کرتے ہیں اور خود یہاں تک آنے کی کبھی تکلیف نہ کی، بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ دوسروں کو تو بیچ میں ڈال کر تکلیف دیں اور خود کوشش نہ کریں۔ اس قسم کے معاملات میں اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ آدمی دوڑانے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے، اگر خود اہل معاملہ ہوں تو انھیں کو بھیجا جائے، نہ ہونے کی صورت میں دوسروں سے یہ کام لینا پڑتا ہے۔ جب سے یہ نیا معاملہ شروع ہوا ہے کبھی بھی کوئی یہاں تک نہیں آیا اور اب تین دن بعد ہی تاریخ ہے، کسی کے نہ ہونے سے یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کس قسم کی امداد درکار ہے، آپ ہی فیصلہ کریں کہ ایسی صورت میں کیا کیا جاسکتا ہے۔

فقط مولانا وصی اللہ صاحب

بقلم محمد یونس خاں فتح پوری

۸ ستمبر ۳۴ء

مولانا فرماتے ہیں کہ جناب کی ارشاد کی تعمیل جہاں تک ممکن ہوگی کروں گا۔

....

حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جواب خط سے بہت خوش ہوکر مطمئن ہوا، اب انشراح میں فرق نہیں ہے، انتظام البتہ

ضروری ہے تا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ہو۔ اخیر میں مثنوی کا ایک شعر لکھتا ہوں جس سے ایک خاص مذاق کی طرف اشارہ ہے ۔

گر ہزاراں طالب اند و یک ملول　　　　از رسالت باز می ماند رسول

والسلام

....

حضرت مولانا صاحب دام مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمد للہ بخیریت ہوں۔ مجھے تردد تھا کہ خط میرا آپ کو ملا یا نہیں، الحمد للہ کہ مل گیا، ڈرتا تھا کہ کہیں آپ کو ناپسند تو نہیں ہوا، بہر کیف اطمینان ہوا، بہت اچھا ہوا کہ تبدیل آب وہوا کی غرض سے آپ نے سفر فرمایا اور ایسی جگہ جہاں کی آب وہوا مزاج گرامی کے موافق ہے اور دیگر اسباب بھی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحت کامل عطا فرما کر دائمی صحت کے ساتھ رکھے اور مشاغل دین میں مشغول رکھے۔ میرے لئے بھی دعا فرماتے رہئے کہ زمانہ کے نشیب وفراز سے بچا رہوں، آمین، والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

....

حضرت مولانا صاحب دام مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمد للہ کہ طبیعت بحال ہے اللہ تعالی آپ کو صحت کامل کے ساتھ رکھے اور اپنی حفاظت میں رکھے۔ حکیم چراغ صاحب کے داماد کے لیے دعا کرتا ہوں، اللہ تعالی ان کی اصلاح فرمائے اور اپنے حقوق پہچانیں اور اہلیہ سے محبت کریں۔ یحیی صاحب کے لیے مقدمہ میں کامیابی کے لیے دل سے دعا کرتا ہوں آج ہی جواب دے رہا ہوں۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

عنایت فرمائے بندہ جناب مولانا دام عنایتکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مولوی صاحب موصوف کے حالات معلوم ہوئے، میں بھی دعا کرتا ہوں اوران کو مشورہ دیا ہے کہ اپنے حالات لکھ کر اپنے شیخ کو مکہ مکرمہ بھیج دیں اوران سے بھی دعا کرائیں، تعویذ دے دیا ہے۔ آپ سے دعا چاہتا ہوں۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

۲۵/ذی قعدہ

۲۳۔ بخشی بازار۔ الہ آباد

....

مولانا سلمکم اللہ تعالی واعزکم اللہ واکرمکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمد للہ بخیریت ہوں، تفصیلی حالات حامل رقعہ سے معلوم ہوں گے، پیش کش حاضر ہے امید کہ قبول فرمایا جائے، ایک معتبر ذریعہ مل گیا اس لیے ارسال ہے۔ والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ

کما قال الشیخ مصلح الدین شیرازی از تلون طبع بادشاہان پر حذر باید بود نقول از تلون آدمیاں آیندگا در دندگان پر حذر باید بود حفظکم اللہ تعالی من جمیع الفتن والشرور(۱)

---

(۱) جس کاغذ پر یہ خط تحریر ہے، اسی پر حضرت محدث الاعظمیؒ کے قلم سے یہ جواب تحریر فرمایا ہوا ہے:

''۲۲/محرم ۸۲ھ

مخدوم محترم حضرت مولانا دامت فیوضکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

والا نامہ مع عطیہ سامیہ بدست حافظ محمد یعقوب صاحب بروقت مل گیا تھا اور موجب عزت افزائی ہوا تھا، مگر شاید جناب والا کو معلوم ہو کہ اس سے کئی دن پہلے سے میں صاحب فراش تھا، پہلے تو اطباء نے گرم ہوا لگ جانے کو کہا، بعد میں ڈاکٹروں نے میعادی بخار تشخیص کیا، ۱۵/دن تک شدید بخار اور سخت دردسر کی تکلیف رہی، بخار ۱۰۳ ڈگری تک ہو جاتا تھا، اس مدت میں غذا بھی ڈاکٹروں نے بند کرادی تھی، ۱۵/دن کے بعد بخار تو اتر گیا مگر کمزوری ونقاہت اتنی ہوگئی تھی کہ آج سے پہلے اپنے ہاتھ سے خطوط بھی نہیں لکھتا تھا۔ چونکہ خط آئے ہوئے بہت دن ہوگئے اور یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ میری پوری کیفیت سے جناب والا کو کسی نے مطلع بھی کیا یا نہیں، اس لیے ہمت کر کے آج یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴ پر

مولانا المعظم زید مجدہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمدللہ بخیریت ہوں، جناب کی خیریت سے مطمئن ہوا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ بعافیت رکھے، آج قبیل عصر مدرسہ کے ڈگری کی خوشخبری پہنچی، **الحمدللّٰہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللّٰہ** اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام واہل مدرسہ کی سعی مشکور فرمائی، اللہ تعالیٰ اسلام واہل اسلام کو تا قیام قیامت غلبہ عطا فرمائے اور اعداء اللہ کے شر ور وفتن سے ہمیشہ محفوظ رکھے آمین یارب العالمین۔

مولانا عبداللطیف صاحب ومولانا ایوب صاحب کی خدمت میں مبارک باد وسلام مسنون عرض ہے، والسلام خیر ختام وصی اللہ عفی عنہ از فتح پوری تال نرجا۔

میں آپ حضرات کے لیے برابر دعا کرتا ہوں اور آپ حضرات سے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں۔

....

بخدمت شریف مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ سے چونکہ تعلق ومحبت ہے اور آپ بھی مجھ کو مانتے ہیں اس لیے عرض کرتا ہوں کہ اس وقت اسلام ومسلمان نزع میں ہیں، اس پر جس قدر بھی رویا جائے اور خون کے آنسو بہایا جائے کم ہے۔

اس کی ذمہ داری مشائخ وعلماء پر عائد ہوتی ہے کہ ان کو اس کا احساس کرائیں۔

حضرات علماء ومشائخ پر لازم ہے کہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اپنی ذمہ داری سے عنداللہ بری ہوں۔

یہ ایک اجمال ہے اس کو ان لوگوں کو جن کو آپ کی ماتحتی میں کر آیا ہوں سنا دیجئے اور سمجھا دیجئے۔ کام کی تفاصیل بہت ہیں کہ اس حالت میں کیسے کام کیا جائے اور کیسے عنداللہ بری ہوا

حاشیہ صفحہ ۷۳ کا بقیہ اس حقیر بے مایہ پر آں محترم کے بہت گراں قدر احسانات ہیں، ان کی مکافات میری استطاعت سے باہر ہے، حق تعالیٰ ان احسانات کی اوفر واوفی جزاء عطا فرمائے۔ اس اعتراف ممنونیت اور تشکر کے ساتھ نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ آپ کے احسانات کے بار عظیم سے میری گردن جھک گئی ہے، اب اگر آئندہ مزید بار میری گردن پر نہ ڈالا جائے تو یہ بھی بہت بڑا احسان ہی ہوگا۔ خدا کرے میرا یہ عرض کرنا موجب گرانی نہ ہو۔ اور اگر خدانخواستہ موجب گرانی ہو تو از راہ کرم معاف فرما دیا جائے۔ والسلام‘‘

جائے اس کو بعد میں ترتیب وار لکھتا رہوں گا۔ پہلے اس اجمال کو لوگ ذہن میں محفوظ کرلیں۔ صرف ایک بات اس وقت کہتا ہوں کہ مسلمان خود اپنی بداخلاقی سے ایک دوسرے کو کاٹے کھاتا ہے، اس وجہ سے یہ من حیث القوم اور من حیث الاسلام نہایت کمزور ہوگیا ہے اور ایک عضو معطل کی طرح ہوکر رہ گیا ہے۔ ایک بات اور عرض ہے کہ یہ ایک راز ہے اور خاص بات ہے اس لیے یہ عوام میں مشتہر نہ ہو بلکہ مخصوص لوگوں کے مجمع میں سنایا جائے۔ اور اس کو سنانے کے بعد تحریر فرمادیں کہ ایا ان لوگوں نے اس کو سمجھا یا نہیں اور کچھ ذمہ داری محسوس کیا یا نہیں، جواب کا منتظر ہوں، والسلام۔

....

مشفقم ومکرم جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب زادمجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میرے خط کا جواب آگیا ہے، وہ تحریر ان کو پسند ہوئی، لہذا میں ان کو بلانا چاہتا ہوں۔ پہلے تو میری رائے یہی تھی کہ قاری طیب صاحب سے مئو ہی میں گفتگو کی جائے۔ لیکن اب بعض خاص مصلحتوں کی بنا پر رائے بدل گئی۔ اور اس مقصد کے لیے میں اب اتراؤں آگیا ہوں۔ اور قاری صاحب کی خدمت میں تار اور خط روانہ کردیا گیا ہے، امید ہے کہ جلد ہی تشریف لائیں گے۔ اب آپ یہیں تکلیف فرما کر تشریف لائیے، یہ جگہ اس امر کے لیے بہت ہی مناسب اور لائق ہے۔ ایک آدھ روز پہلے ہی آپ آجائیں گے، بہت اچھا رہے گا۔ تکلیف ضرور ہوگی اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے، انتظام سواری کا رہے گا، آدمی جارہا ہے اگر آپ چاہیں تو جس سے دل بھرے اس کو ساتھ لے لیجئے گا، والسلام

وصی اللہ عفی عنہ از اتراؤں

....

محبّ مکرم سلمہ اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمدللہ بخیریت ہوں، آپ کی دعاؤں کا ممنون ہوں۔ ملاقات کے لیے دل میرا بھی چاہتا ہے، انشاءاللہ تعالیٰ جلد ملاقات ہوگی۔ اس ماہ مبارک کی برکات کے حصول کے لیے دل سے دعا کرتا ہوں۔ اتنا زیادہ کام نہ کیجئے جس سے تھک جایئے، اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا کام بھی کافی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وقوت عطا فرمائے، اور ہم سب کو اخلاص کی دولت نصیب فرمائے۔ والسلام خیر ختام

مولانا صاحب دام عنایتکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمدللہ بخیریت ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو بخیریت رکھے۔ کتب خانہ واقعی اچھا مل گیا ہے، قلمی کتابیں بھی ہیں، میں تو اب سمجھ رہا ہوں کہ میری باتیں اب وہاں لوگوں کو ناگوار نہیں ہوتیں، یہ اطمینان بڑھتا جا رہا ہے، طبقات آگئی، مولانا ضمیر احمد صاحب کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، الحمدللہ کہ سب لوگ بخیریت ہیں، میاں خلیل صاحب کو سلام کہیے، والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

....

مولانا ادام اللہ فیوضکم وبرکاتکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمدللہ بخیریت ہوں، زمین کے متعلق عزیزم خلیل صاحب کو کہہ دیا ہے، دریافت فرمالیجیے۔ رسالہ[1] بے حد پسند ہے، ابھی دیکھ رہا ہوں پھر تفصیل سے لکھوں گا انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ آپ سے دین متین کی صحیح خدمت لے، آمین، والسلام

دعاگو وصی اللہ عفی عنہ

....

حضرت مولانا دام عنایتہٗ !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں بخیریت ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھے اور عافیت تامہ کے ساتھ قائم رکھے، مجھ کو آپ کی محبت کی بڑی قدر ہے، اللہ تعالیٰ ہم لوگوں میں کامل ارتباط پیدا فرمادے، دل سے برابر یاد رکھتا ہوں، خاص طور پر دعا کیا کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ حاجی خلیل صاحب کو سلام کہیے اور جس کو آپ کا جی چاہے بلکہ جو ملے اسی کو کہہ دیجیے، والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ

(۱) ''رکعات تراویح'' مراد ہے۔

تبصرہ

حیات ابوالمآثر

از: ڈاکٹرغطریف شہباز ندوی

۹ رنومبر ۲۰۱۲ کی دو پہر کو میں برادر ابوشیبہ (علامہ حبیب الرحمٰن محدث اعظمیؒ کے پڑپوتے) کے ہمراہ ان کے مکان میں داخل ہوا۔ اور دیر تک اس مکان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ مکان کیا تھا شکستہ سی دیواروں کے چند کمرے، پرانی وضع کی یک منزلہ چھوٹی سی عمارت!! مہمان خانہ میں، جو دفتر بھی تھا، مولانا کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا رشید احمد اعظمی مدظلہ العالی سے ملاقات ہوئی، وہ بڑی انکساری وتواضع سے پیش آئے اور ساتھ میں کھانا کھلایا۔ مجھے جلد ہی دہلی لوٹنا تھا اس لیے تھوڑی سی گفتگو کے بعد، جس کتاب کی طلب میں حاضر ہوا تھا وہ آپ سے بتائی اور اجازت لے کر رخصت ہوا۔ مگر دیر تک یہ تأثر قائم رہا کہ اس شکستہ سے مکان میں وہ شہنشاہِ علم رہتا تھا، جس کو مئو میں لوگ عقیدت ومحبت سے ''بڑے مولانا'' کہتے ہیں، جن کو علامہ شبیر احمد از ہر میرٹھیؒ جیسے عظیم محدث ومفسر نے ''حبر نبیل'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

آج مئو محدث اعظمیؒ کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ جن کے نام اور کام سے میں بچپن میں ہی آشنا ہو چکا تھا اور ان کے مفصل حالات کی بڑی جستجو تھی، اور اسی وجہ سے اسلامک فقہ اکیڈمی نے جب مئو میں ۸، ۹ نومبر ۲۰۱۲ کو ''ہندوستان میں فقہی سرمایہ'' کے موضوع پر دوروزہ سیمینار منعقد کیا تو راقم بھی اس میں شرکت کے لیے تیار ہو گیا۔ اسی موقع سے حضرت کے وارثین سے ملاقات کا پروگرام بنایا تھا۔ دہلی واپسی کے کوئی دس دن بعد مطلوبہ کتاب ''حیات ابوالمآثر'' مؤلفہ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی بھی موصول ہوگئی۔ کتاب دو جلدوں میں ہے اور ہر جلد کوئی ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اولین فرصت میں دونوں جلدیں پڑھ ڈالیں۔ یہاں اسی کتاب سے متعلق چند تأثرات پیش کیے جا رہے ہیں۔

علامہ حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے مئو میں آنکھ کھولی، اس کے قدیم اور تاریخی مدرسہ دار العلوم سے تعلیم حاصل کی۔ خدا کی شان یہ کہ دو بار دار العلوم دیوبند میں پڑھنے کے لیے داخل کیے گئے، مگر دونوں ہی بار کچھ عوارض خاص کر طبیعت کی ناسازی کے ایسے پیش آئے کہ ان کو دار العلوم سے فراغت کا موقع نہیں

ملا۔ غالباً مشیتِ الٰہی تھی کہ ایک چھوٹی سی جگہ سے پڑھ کر مئو کی خاک سے جو ذرہ اٹھے وہ علوم اسلامیہ اور بطور خاص علم حدیث کا نیر تاباں بن کر عالم اسلام کو منور کر جائے۔ ایسی بارعب، پرہیبت اور جلیل القدر شخصیات کم ہی ہوتی ہیں جن کے علمی جاہ وجلال کا ڈنکا ہر طرف بج جائے جیسا کہ حضرت اعظمیؒ تھے، جن کی زیارت کے لیے علامۃ الشام شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ تین تین بار مئو جیسے دور افتادہ قصبے میں تشریف لائے۔ جن کی خدمت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جیسے مشاہیر نیازمندوں کی طرح پیش آتے تھے۔ جن کو شیخ الازہر امام اکبر شیخ عبدالحلیم محمود نے **اکبر علماء العالم الاسلامی** (دنیا کے سب سے بڑے عالم) کا خطاب دیا۔ جنھوں نے اپنی پہلی ملاقات میں **انا حبیب الرحمن الاعظمی من الھند** کہہ کر تعارف کرایا تو ان کے لیے علامۂ نجد شیخ عبدالعزیز بن باز احتراماً اپنی کرسی سے کھڑے ہوگئے اور اس پر آپ کو بٹھا دیا۔ جن کو علامہ یوسف القرضاوی جیسے بڑے فقیہ نے دوحہ قطر کے اپنے مرکز بحوث ودراسات السیرۃ میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ جیسے جدید وقدیم کے جامع جن سے استفادہ کرنے میں فخر جانتے تھے۔ جن سے سید الطائفہ سلیمان ندویؒ عمر میں ان سے بڑے ہونے کے باوجود علمی مسائل میں صرف استفادہ ہی نہیں بلکہ اپنی کتابوں پر نظر ثانی کراتے تھے۔ جن کو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ جیسے اکابر کا اعتماد حاصل ہوا۔ جن کو ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے شاہ ولی اللہ ثانی کہا۔ اس کتاب کو پڑھ کر میری زبان سے نکلا کہ حق یہ ہے کہ محدث عمر بن عبسہؒ کا وہ جملہ دہرایا جائے جو انھوں نے مشہور تابعی ابوقلابہؒ کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مجلس میں کہا تھا کہ "**ھذا الجند بخیر مادام ھذا الشیخ بین اظھرھم**" (اہل شام خیر کے ساتھ رہیں گے جب تک یہ شیخ ان کے درمیان موجود ہیں)

کتاب کا پہلا حصہ ۱۲/ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں فاضل مصنف جو حضرت اعظمی کے نواسے ہیں، نے حضرت اعظمی کے وطن، خاندان، پیدائش، نشو ونما، اساتذہ، تلامذہ، تدریسی وتالیفی خدمات، اسفار، سیاسی مصروفیت، نثر ونظم، اعیان کی وفیات پر حضرت کے تأثرات، خانگی زندگی، اخلاق وعادات علامہ اور تصوف، مبشرات وکرامات، علامہ اعظمیؒ اہل علم کی نظر میں وغیرہ جیسے مباحث پر تفصیل سے قلم اٹھایا۔ آثار قلم کے ایک الگ عنوان سے مولانا کے تمام مضامین کے نام اور حوالے اور ان کی وفات پر جو مراثی تحریر کیے گئے ان سب کو جمع کیا گیا ہے۔ فہرست مراجع اور رسائل وغیرہ کا اشاریہ دیا گیا ہے۔ یوں اس جامع مرقع کو پڑھنے کے بعد یہ

فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ محدث کبیرؒ کی شخصیت اس قدر متنوع اور مختلف الجہات تھی کہ سید العلماء سید سلیمان ندویؒ نے بجا طور پر ان کو ہندوستان کے دوائرِ علم میں شمار کیا تھا۔ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے نہایت محنت سے حضرت العلامہ کی حیات وخدمات سے متعلق مباحث اور تحریروں کو بڑی عرق ریزی سے جمع کیا اور ان کو ایک جاندار تذکرہ اور ایک دلکش سوانحی مرقع کی صورت میں پیش کردیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ حضرت اعظمیؒ کی علمی خدمات کے تعارف وتلخیص پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل ایک ارمغان علمی ہے جس میں نہایت جامعیت وکمال کے ساتھ علامہ اعظمی کی وسیع الاطراف خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں حضرت محدث اعظمی کی کتابوں کی حیرت انگیز معلومات، مخطوطات سے شغف، تفسیر واصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، متون ورجالِ حدیث کی مہارت، فقہی مرجعیت، عربی زبان وادب اور دیگر مروجہ علوم اسلامیہ پر علامہ کی مہارت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''علامہ اعظمی فتنوں کے تعاقب میں'' کے تحت ردسلفیت، ردشیعیت، ردرضاخانیت، اور فتنۂ انکار حدیث پر روشنی ڈالی ہے۔ علامہ کے ردود کی خاصیت یہ ہے کہ وہ علمی دنیا کے مسلمہ اصولوں پر بھی پورے اترتے ہیں اور اپنے اسلوب اور زبان وبیان کے اعتبار سے بھی چاشنی لیے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی خوش گوار طنزیہ جملوں نے ان کو نہایت کاٹ دار بنادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ معاندین حضرت کے علمی تعاقب کے آگے ڈھیر ہوجاتے تھے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس جبل العلم سے ٹکرائے۔

علامہ ناصر الدین البانیؒ نے حدیث کی مختلف کتابوں کی تحقیق، تعلیق اور تحشیہ سے پوری عرب دنیا میں ایک غلغلہ ڈال رکھا تھا۔ اور ان کے شذوذ اور ناروا حملوں سے حضرت امام اعظمؒ اور دوسرے حنفی ائمہ بھی محفوظ نہیں تھے۔ قارئین کو یاد دلادوں کہ باوجود اپنے تمام ادعائے علم وتحقیق اور دعوائے عدم تقلید کے البانیؒ صاحب نے اپنی ''الضعیفہ'' میں امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں خطیب بغدادی کی اڑائی ہوئی اس ہفوات پر جزم ویقین کرلیا کہ امام صاحب کو کل ۱۷ حدیثیں پہنچی تھیں۔ یہ اور اسی طرح کے بہت سے الزامات حنفی ائمہ پر انھوں نے لگائے ہیں۔ جن کا جواب باصواب علامہ اعظمیؒ نے **الألبانی شذوذہ وأخطاءہ** لکھ کر دیا۔ مخطوطات ومسودات کی چند عکسی تصاویر اور ردودِ مذکورہ کی تفصیل کے ساتھ فقہیات میں محدث اعظمیؒ کی خدمات بھی اہم باب ہے۔ جس میں ''انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت'' ہمارے علماء وفقہاء اور اربابِ افتاء کے لیے نہایت چشم کشا بحث ہے۔ کیونکہ ہمارے بہت سے مفتیان کرام اور مصنفین اس باب میں افراط

وتفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ اس باب میں حضرت اعظمیؒ نے مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا تھانویؒ پر بھی نقد فرمایا ہے۔ دست کار اہل شرف بھی اسی موضوع سے ملتی جلتی کتاب ہے اور اس لائق ہے کہ نسب فروشی کے سارے دوکان دار اسے پڑھیں۔ اموی دور خلافت اور خاص کر سیدنا معاویہؓ اور ان کے بیٹے یزید پر لعن طعن کیا جاتا ہے۔ حضرت محدث اس وادی میں بھی افراط وتفریط سے ہٹ کر گزرے ہیں اور اس سلسلہ میں مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیبؒ اور مولانا اطہر مبارک پوریؒ پر گرفت فرمائی ہے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ محدث اعظمی کے سامنے اصل چیز احقاقِ حق ہے، اور اس کے لیے انھیں اگر اپنی جماعت کے بزرگوں یا اپنے احباب پر بھی تنقید کرنی پڑے تو اس سے قدم پیچھے نہیں ہٹاتے اور اس میں کسی جنبہ داری یا جماعتی تعصب کو راہ نہیں دیتے۔

اس کے بعد عربی تصانیف ومضامین کے تحت مؤلف نے علامہ اعظمیؒ کے حدیثی کارناموں کا ذکر کیا ہے، جن میں مسند حمیدی، کتاب الزہد، سنن سعید بن منصور، مصنف عبدالرزاق، مختصر الترغیب والترہیب، المطالب العالیہ، کشف الاستار، کتاب الثقات لابن شاہین، استدراکات قاسم قطلو بغا، رسائل شاہ ولی اللہ، حیاۃ الصحابہ، فتح المغیث، اور جزءخطبات النبی اہم ہیں۔ راقم کے نزدیک یہی حصہ اس کتاب کا مغز ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث کی ان عظیم کتابوں کی خدمت کے سلسلہ میں محدث اعظمی نے کتنی جان فشانی کی ہے اور کس طرح محنت ومشقت سے وسائل نہ ہونے کے باوجود ایک چھوٹے سے قصبہ میں بیٹھ کر اس فرد فرید نے وہ کام کر دیا جس کو یوروپ میں بڑی بڑی اکیڈمیاں کیا کرتی ہیں۔

ہمارے علمی حلقے اور خاص کر علماء کے طبقہ کو جس میں تن آسانی اب عام ہو چکی ہے، اس کتاب کو ضرور پڑھنا چاہئے کہ ان کو پتہ چلے کہ ان کی صفوں میں کیسے کیسے گوہر نایاب گزرے ہیں اور اب وہ خود کس حال میں ہیں۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے علامہ کے چند مکاتیب دے کر اس میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ غرض یہ کہ کتاب کیا ہے پورا کتب خانہ ہے جس کو فاضل مصنف نے ۵۸۷ صفحات میں جامعیت کے ساتھ لکھا ہے اور یوں حضرت ابوالمآثر کی مفصل سوانح عمری اور ان کی علمی وفکری خدمات پر دو ضخیم جلدیں لکھ کر علماء ہند پر سے ایک بڑا قرض اتار دیا ہے۔ توقع ہے کہ کتاب مقبول ہوگی اور محدث اعظمی کے مطالعات کی نئی راہیں کھلیں گی۔ کیا اچھا ہوا گر اس کتاب کا عربی اور انگریزی ترجمہ بھی کروا دیا جائے۔ عرب دنیا کے علاوہ مستشرقین اور مغرب کے لوگ بھی آپ کے حالات سے کماحقہ واقف ہو سکیں۔